ہندوستانی مشترکہ تہذیب اور اردو غزل

(مونوگراف)

از

طاہرہ منظور

INTRODUCTION

A Culture is a Society's Social heritage, the system of ideas values, Beliefs, knowledge, Norms, Customs and Technology that every one in a Society shares. A culture is not simply an accumulation of isolated symbols, languages, values, norms, behaviour, and technology. It is an organized system of many interdependent factors and its organization is influenced by physical and metaphysical factors, material factors and non-material or abstracts factors.

Our culture is reflected through our language and literature, since Ghazal is a vital part of Urdu literature it has accompanied contemporary thought and circumstances in all ages. This very ghazal is that explanation of human civilization in which, from aesthetic senses to political and economical thoughts, are included. There are mistakes of moments which followed exploitation for centuries, if there is warmth of individual sentiments, on the other hand, it contains the statement of collective values. In short the roots of Urdu Ghazal are penetrating almost every department of human culture, that is why, Urdu Ghazal is said to be THE TRUE REFLECTOR of Indian culture.

This Monograph **"Composite Indian Culture and Urdu Ghazal"** Throws light not only on Ghazal and Daccani Cultural aspect of Ghazal, but it also provides a comprehensive and precise explanation of Culture in respect of Urdu Ghazal.

I am very grateful to I.C.C.R. and concerned authorities for providing me this great opportunity to write this monograph, and contribute something in concrete in the promotion of our rich and composite Indian Culture.

I am also thankful to the librarian of Moulana Azad Library and others, who have helped me by providing books and relevant material during the research period. Had these people not been there this monograph would not have been completed in time.

Thank you.

(MISS TAHIRA MANZOOR)

ابتدائیہ

انسانی فہم بامعنی اقدار کو جنم دیتی ہے اور مذہب اُن کا امین بنتا ہے۔ روحانیت، پرشکوہ خیالات، پاکیزہ جذبات اور روشن مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے۔ اسی طرح قومی وراثت فن، ہنر، خیال اور پہچان عطا کرتی ہے۔ اس پہچان کو وقت و حالات کے مطابق تغیر و تبدل کے ساتھ جب زندگی کا ناگزیر حصہ بنالیا جاتا ہے تو وہ بھی تہذیب کے دائرۂ کار میں آجاتا ہے۔ چوں کہ انسان کا اپنا مطمعِ نظر، ایک نصب العین ہوتا ہے اگر یہ نصب العین کسی قوم کی مکمل زندگی کا احاطہ کرتا ہے اور جسے متفقہ طور پر اپنا بھی لیا جاتا ہے تب وہ تہذیب کے دائرے میں آجاتا ہے، جس کے لیے وہ اپنے جغرافیائی حدود میں قانونی، سیاسی، معاشی، سماجی ادارے قائم کر کے اس میں اپنا یقین واعتماد ظاہر کرتے ہیں اور یہی جذبہ قوم کی راہِ مستقبل متعین کرتا ہے۔

تہذیب فکر و عمل کی اجتماعی یافت کا نام ہے، بلکہ افکار ہی اعمال کو جنم دیتے ہیں۔ اور ایک پورا معاشرہ جب ان تصورات کو بروئے کار لا کر ایک شناخت حاصل کرتا ہے تو تہذیب کی نمود ہوتی ہے، مگر یہ سفر صدیوں میں طے ہوتا ہے۔ ایک مدت گزرنے کے بعد تہذیب برگ و بار لاتی ہے اور اپنا امتیاز حاصل کرتی ہے۔ یہ یافت اجتماعی مساعی کی مرہونِ منت ہوتی ہے جس میں معاشرہ کا فراواں احساس ہی تحرک، زندگی و توانائی بخشتا ہے اس احساس کے بہت سے پہلو یا عناصر ہوتے ہیں جو مل جل کر اس اصطلاح کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس میں عقائد و افکار کا بڑا دخل ہوتا ہے، ان سے ذکر و فکر کے ساتھ زندگی اور مابعد زندگی کے تمام سانچے تیار ہوتے ہیں۔ تصورات کی ایک بے کراں دنیا اس کوزہ میں بند ہوتی ہے۔ بود و باش کے طور طریقے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ فن و فلسفہ بھی اثر پذیری سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ زبان و بیان یا اظہار کے وسیلے بھی فیض حاصل کرتے ہیں۔ جغرافیائی مظاہر کے ان گنت عناصر

کی کارفرمائی سے انکار ممکن نہیں ہے۔ سائنسی یا تکنیکی ایجادات بھی تہذیب کو عروج بخشتے ہیں۔ علائم و احساسِ جمال بھی اس سے متعلق ہوتے ہیں۔ سیاست وتمدن کے ساتھ سیرت وکردار سازی کے اصول وثبوت اہم رول ادا کرتے ہیں۔ غرض زندگی کی بھرپور ترجمانی اس میں ہوتی ہے، جو ایک بڑے علاقہ پر محیط ہوتی ہے۔ اسی اجتماعیت اور ارتکاز کو ثقافت سے تعبیر کرتے ہیں جو اقدار کا مجموعہ ہوتا ہے۔

میرے نزدیک تہذیب اُن تمام اقدار کا سرچشمہ ہے جسے کسی قوم نے زندگی گزارنے اور اسے راہِ عمل بنانے کا محور مان لیا ہو، پھر تہذیب کا دائرہ ایک مخصوص علاقے، آب وہوا، تاریخ، سیاست، معاشرہ اور اس کے رسم ورواج و مذہب تک پھیلا ہوا ہے، جس میں بیرونی افکار، خارجی وداخلی تمدنی اثرات، مادّی وغیر مادّی روایات، اکتسابی جمالیات وفن وفکر وہ محرکات ہیں جو تہذیب کا سرمایہ ہوتی ہیں۔

دراصل تہذیب، آدمی کے ماضی، حال اور مستقبل کے جامع یا ہمہ گیر نوعیت کا نام ہے۔ یہ کامیاب زندگی گزارنے کا طریقہ وسلیقہ، ترغیبی طاقت، زندگی کی روح یا حیات اور فکر وعمل کی محرک ہے۔ دنیا وکائنات سے دوستانہ رویہ، محبت وخلوص اور ہمدردی، پیدا کرنے والے جذبہ کا نام تہذیب ہے۔ معاشی، سیاسی، جغرافیائی، اخلاقی، مذہبی، سماجی، تعمیری، ادراکی تصورات کے مشترکہ اثر سے تہذیب بنتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہماری مثبت سوچ اور اس پر کیا گیا عمل بھی تہذیب ہی ہے۔ اسی لیے انسانی معاشرے کی تشکیل میں تہذیب کا کردار بنیادی ہوتا ہے۔ معاشرہ میں فکر، مذہب فلسفہ اور زبان اہم عناصر ہیں۔ یہی زبان انسان کی سوچ اس کی فکر، فلسفہ، خیالات واحساسات کی ترجمانی کرتی ہے، یہی ترجمانی تحریر میں آکر کسی بھی قوم کا ادب بن جاتی ہے اور ادب کی ایک اہم شاخ شاعری ہے۔

ہر فنکار جو اپنے سماج کا ایک فرد ہوتا ہے اپنی ہی تہذیب کی آغوش میں پلتا بڑھتا ہے۔ چنانچہ اقدار اور روایات اس کے اخلاق کو، ذوق وشعور، اس کی قابلیت کو، زندگی کے تجربات اس کی فکر کو جلا بخشتے ہیں۔ جس شاعر کے یہاں عصری آگہی کا شعور جتنا پختہ ہوگا اس کی شاعری اتنی ہی جاوداں اور احساسات سے لبریز ہوگی۔ چوں کہ شاعری اور اقدار کا چولی دامن کا ساتھ ہے اسی لیے اقدار بدلتے ہیں تو شاعری بدلتی ہے۔ اقدار بلند ہوتے ہیں تو شاعری بلندیوں کو چھوتی ہے اور اگر اقدار انحطاط کا شکار ہوں تو شاعری مبتذل ہو جاتی ہے۔ شاعر تہذیبی سرگرمیوں اور تمدنی پیش رفت کے بھی زیر اثر رہتا ہے۔ وہ کسی بھی انسان سے چوں کہ زیادہ حساّس اور مفکر ہوتا ہے اس لیے وہ کسی بھی حادثہ، واقعہ یا

جذبے پر سب سے پہلے غور وفکر کرتا ہے اور ردِ عمل ظاہر کرتا ہے۔ یہ ردِ عمل مثبت ومنفی دونوں ہوتے ہیں مگر مقصد تعمیری ہی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری احساسِ حسن، لذت، کیف کے ہی نہیں، دل و دماغ، مادّہ وفطرت، حقیقت وکیفیت کی کشمکش، اخلاقی وغیراخلاقی، سیاسی وغیرسیاسی تصورات کے تصادم کے ساتھ عصری آگہی وتہذیبی روایت کی بھی ترجمانی کرتی ہے۔ اور اس تصادم کے نتیجے میں جب نئی تبدیلیاں وجود میں آتی ہیں تو یہ تہذیب کا حصہ بن کر نئے اشاروں، کنایوں اور اصلاحات کی صورت میں شاعری کا حصہ بن جاتی ہیں۔ اسی لیے خارجی وداخلی حالات شاعر کی مشاہداتی قوتِ نظر کی حدود میں رہتے ہوئے اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ شاعر کا تجزیہ جتنا گہرا ہوتا ہے اس کے بیان میں اتنا ہی خلوص اور اثر ہوتا ہے۔

یہ ترجمانی ادب کی ہر صنف میں ہوئی، مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، غزل، قطعہ، رُباعی، دوہے وغیرہ وہ شعری اصناف ہیں جن میں تہذیب پوری طرح جلوہ افروز نظر آتی ہے۔ جب کہ غزل جو زندگی کی ترجمان ہے اس نے ہر عہد میں عصری حالات وخیالات کا ساتھ دیا۔ یہی غزل انسانی تہذیب کی تفسیر ہے جس میں اس کے جمالی احساسات سے لے کر سیاسی ومعاشی افکار تک شامل ہیں۔ تاریخ میں کی گئی لمحوں کی خطا بھی ہے تو صدیوں کا استحصال بھی، انفرادی جذبوں کی آنچ بھی ہے اور اجتماعی قدروں کا بیان بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ غزل کی جڑیں تہذیب کے ہر شعبے تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اسی لیے اردو غزل کو تہذیبِ ہند کی تمام روایات کا پاسدار کہا جاسکتا ہے۔ اردو غزل نے دکنی دور اور مغلیہ عہد سے لے کر انگریزی اور آزاد جمہوری نظام تک دیکھا ہے، اور خود کو ہر عہد کے سانچے میں ڈھال لیا، اس نے دھڑکتے دلوں کے دہکتے جذبوں کو، وحدت الوجود، وحدت الشہود کے نظریوں کو ہر قسم کے فلسفیانہ تصورات کو، آزادی کے نغموں کو ہمیشہ اپنے دامن میں سمیٹا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو غزل ہماری مشترکہ تہذیب کے انعکاس کا دوسرا نام ہے۔ شمالی ہند میں تفننِ طبع کے طور پر کہی جانے والی اردو غزلوں کے برعکس دکنی ہندوستان کی غزلیں اپنے عہد کے معاشرے، اس کی سوچ، اس کی فکر، اس کے تہذیبی رویوں کا عکس ہیں۔ دکنی ہند میں دوہوں کا عام رواج تھا جس میں نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں کی طرف سے عورتوں کے لہجے میں مردانں کے جذبات و احساسات کا اظہار کرتے تھے۔ چنانچہ ابتدائی دکنی غزلوں میں بھی یہی طریقۂ اظہار اپنایا گیا۔ اسی کے ساتھ ہندوستانی پیڑ، پودے، پھول، پتّیاں، چرند وپرند، مندر وپوجا، سنیاس وبھوگ، تپسّیا ودرشن، اوتار و

زنار جیسے عناصر وتشبیہات و استعارات کا استعمال بلا جھجک ہوا۔ اس میں صوفیانہ کلام بھی تھا تو جنسی جذبات وخواہشات کا اظہار بھی۔ دکن میں آرائشِ جمال کے لیے جو اشیاء تہذیب پر چھائی ہوئی تھیں ان کا برملا اظہار ملتا ہے۔ کنگھی، چوٹی، مسّی، کاجل، بنگڑی، کنٹھ مال، زنجیر، گل سر، حمایل چوسر، حلوہ، شکر پارہ، شیر، نان، قلیہ، خیال، کڑکے، گیت، دف، رباب، ڈھولک وغیرہ پورے زور وشور سے موجود ہیں۔ سماجی ڈھانچے میں موجود بسنت، ہولی، دیوالی، مرگ، رام نومی، جنم اشٹمی، عید، محرم جیسے تہوار پورے کرّ وفر سے منائے جاتے ہیں اوران کا غزلوں میں اس خوبصورتی سے ذکر ہوتا ہے کہ پٹاخوں کی گڑگڑاہٹ، دیوالی کی روشنی، محرم کا سوز، بسنت کا دھان، پرندوں کی چہچہاہٹ، محفلوں کی رونقیں، معاشرے کی رواداری آج بھی ان کے ذریعہ محسوس کی جاسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو غزلوں کا ابتدائی دور خالص ہندوستانی تھا۔ اس کی ساخت ضرور فارسی رہی مگر فارسی روایات کو ولیؔ اوران کے بعد خاص طور سے برتا جانے لگا تھا۔ فائیؔ، ہاشمیؔ، قلی قطب شاہ، زور، محمودؔ، غواصیؔ، عبداللہ قطب شاہ، ابوالحسن تانا شاہ وغیرہ کی غزلوں میں رام، کرشن، اوتار، شیام، مدن جیسے دیوتاؤں کا ذکر ہوتا ہے وہیں، فال، جوگان، مہندی، پان، بندی، تعویذ، قشقہ، بھبھوت کے ساتھ مسجد، زاہد، واعظ، نماز کے علاوہ عیسیٰ، مریم، زمزم، ابراہیم، لیلیٰ، مجنوں، شیریں، فرہاد جیسی تلمیحات بھی ملتی ہیں۔

دکن اپنی سیکولر روایات کا ہمیشہ سے امین رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی غزلیں جو عصری تمدن وثقافت کی آئینہ دار ہیں ہم تک وہی عکس پہنچاتی ہیں جو حقیقت پر مبنی ہیں۔ ولیؔ، سراجؔ، عزلتؔ و داؤدؔ کے عہد تک اورنگ زیب نے دکن کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا اب اردو شعر وادب کی سرپرستی اس طرح نہیں تھی جیسی اُس سے قبل ہوتی تھی۔ بہر حال ولیؔ کے عہد کی غزلیں بھی ہندوستانی مشترکہ اقدار کی ترجمان ہیں۔ اس عہد میں غزلوں پر صوفیانہ تصورات حاوی ہیں۔ ہندو اساطیر و دیو مالائی اور اسلامی روایات وتلمیحات کے ذریعہ معاشرے میں یکجہتی، وحدانیت، بلند اخلاقی وروحانی صفائی کی طرف توجہ دی جارہی تھی۔ وہیں فارسی مضامین جو عشق کے لافانی احساس اور زندگی کے انفرادی تجربوں کے حامل تھے انھیں اردو غزلوں میں بھی شامل کیا جانے لگا تھا۔

یہ مقالہ (مونوگراف) ہندوستانی مشترکہ تہذیب اور اردو غزل Composite Indian Culture and Urdu Ghazal کے عنوان سے تحریر میں لیا گیا ہے، جس میں تہذیب کی وضاحت کے ساتھ غزل اور دکنی غزل کے تہذیبی رویوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دکن کے بعد شمالی ہند میں بھی اردو غزل کو وہ عروج حاصل ہوا جس کی مثالیں موجودہ دور تک پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ مختصر مونوگراف اور وہ بھی ایک محدود مدت کی شرط کے ساتھ، اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ تقریباً چار پانچ سو برسوں پر محیط غزل کے تہذیبی تناظر کو قلم بند کر سکے۔ وہ بھی اس طرح کہ جامعیت میں کمی نہ آئے۔ چنانچہ میرا یہ مونوگراف (مختصر مقالہ) تہذیب کی وضاحت، غزل اور تہذیب کے باہمی رشتے و دکن کی غزلوں میں ہندوستانی مشترکہ تہذیبی اقدار تک محدود ہے۔ اس امید کہ ساتھ کہ .I.C.C.R کی مولانا آزاد لائبریری اس مقالے کو قابلِ اشاعت سمجھے گی۔

میں شکر گزار ہوں کہ .I.C.C.R نے مجھے اس قابل سمجھا اور موقع فراہم کیا کہ ہندوستان کی لازوال مشترکہ تہذیب اور اصناف میں غزل کے حوالے سے یہ مقالہ لکھوں۔ میں شکر گزار ہوں لائبریرین مولانا آزاد اور معاونینِ لائبریری کی جنھوں نے مجھے بہ وقتِ ضرورت کتابوں کی فراہمی میں پوری طرح مدد کی۔

طاہرہ منظور

ہندوستانی مشترکہ تہذیب اور اردو غزل

تہذیب کیا ہے؟ اس کی مکمل و مستند تعریف دینا ٹھیک اسی طرح مشکل ہے، جس طرح حیات، حسن، محبت اور شاعری وغیرہ کی کوئی ایک مقرر تعریف بیان کرنا۔ باوجود اس کے ہم جانتے ہیں تہذیب انسانی زندگی کی ترغیبی طاقت ہے۔ اس کی روح ہے، حیات ہے اور یہی فکر و عمل کی تحریک پیدا کرتی ہے۔ علاوہ ازیں مثبت سوچ، گزرتے حالات، واقعات، حادثات، تجربات، تعمیرات اور اخلاقیات تہذیب کا ورثہ بنتے جاتے ہیں، وہ ورثہ، جو گزرتی صدیوں کے ساتھ نسل در نسل نہ صرف منتقل ہوتے جاتے ہیں بلکہ جن میں ہر عہد اور نسل کے ساتھ بتدریج اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

تہذیب اپنے آپ میں بڑے وسیع مفہوم کا حامل لفظ ہے چوں کہ حسن کا معیار ہو یا زندگی کی سچائیاں یا وہ اقدار جو مکمل حیاتِ انسانی پر مشتمل ہیں تہذیب کا حصہ ہیں اور یہ حقیقتیں کسی ایک تعریف میں نہیں سمیٹی جاسکتیں۔ ارتقائے زمانہ یہ ماحول اور وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ وسیع ہوتی رہتی ہیں۔ جیسے جیسے انسان ترقی کرتا جائے گا اس کے تمام عظیم کارہائے نمایاں (مادّی و غیر مادّی) اس لفظ میں ضم ہوتے جائیں گے۔

ہر عہد میں ہونے والے داخلی و بیرونی حالات و انقلاب تہذیب کو لگاتار متاثر کرتے رہتے ہیں، جس سے تہذیب کے بنیادی ڈھانچے میں تو کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی، مگر وہ ظاہری طور پر جو ردِ عمل پیش کرتی ہے وہ جسم پر لبادہ کی تبدیلی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ ابنِ خلدون اور برنٹن نے تہذیبوں کے عروج و زوال کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ جہاں خلدون نے فضا، آب و ہوا، فطرت، قدرتی ماحول، انسانی عادات و افکار کو لے کر صدیوں قبل مختلف تہذیبوں کا جائزہ اور اس پر اپنے حکم صادر کیے ہیں۔ وہیں برنٹن نے آغازِ انسانی تہذیب کا اجمالی خاکہ پیش کر کے نہایت تفصیل

سے مختلف قدیم ترقی یافتہ تہذیبوں کا مطالعہ اوران کے اسباب پر کھل کر بحث کی ہے۔ برنٹن قدیم و جدید یا نئے و پرانے حجری دور کے فرق کو واضح کرتے ہوئے پہیہ کی ایجاد کے متعلق لکھتے ہیں:

''نئے حجری دور میں تقریباً وہ تمام چیزیں وجود میں آ چکی تھیں جواب تہذیب یافتہ ملکوں میں پائی جاتی ہیں صرف شہر وجود میں نہیں آئے تھے''۔ ۱

یعنی تمدنی اشیاء کی فراہمی حجری دور میں اپنا مقام رکھتی تھیں لیکن تمدن بہ معنی شہریت ابھی آغاز نہیں ہوا تھا۔ اس دور میں انسان اپنے حالات و وقت کے مطابق مہذب ضرور تھا، مگر متمدن نہیں تھا۔ سب سے پہلے ذہن میں یہ واضح ہونا ضروری ہے کہ تہذیب وتمدن میں حقیقتاً کیا فرق ہے۔ عموماً ہمارے ادب ونقد میں تہذیب وتمدن مترادف معنی میں سمجھے واستعمال کیے جاتے ہیں۔ جس کے سبب قاری مسلسل الجھن کا شکار رہتا ہے۔ جمیل جالبی کے مطابق تمدن:

''تمدن (مدنیت ، تہذیب و تمدن)، اصلاح، تربیت، درستی، انسانیت، شائستگی، انسانی معاشرے کی وہ کیفیت جس کی امتیازی خصوصیت ذہنی، تکنیکی، تمدنی اور معاشرتی ترقی ہوتی ہے۔ وہ اقوام جو ترقی کی اس منزل تک پہنچ چکی ہیں تہذیبی ترقی کی بدولت حاصل شدہ آسائشیں، مہذب بنانے یا مہذب ہونے کا عمل مخصوص زمان و مکان یا گروہ.... عموماً مفہوم ویران علاقوں کے برعکس گنجان آباد خطے''۔ ۲

اور فارسی میں تمدن:

''شہیر نشین شدن، خوی شہری گزیدن و با اخلاق مردم شہر آشنا شدم، زندگانی، اجتماعی ہمکاری مردم با یکدیگر در امور زندگانی وفراہم ساختن اسباب ترقی وآسائش خوذ''۔ ۳

اس طرح ''بیان اللسان'' میں تمدن کے معنی ''شہروالوں کی تہذیب اختیار کرنا'' ہے۔ ۴ اور لغاتِ کشوری کے مطابق:

''شہر میں رہنا، انتظامِ شہر کرنا، پیشہ وروں کا ایک جگہ جمع ہونا''۔ ۵

جب کہ ماہرینِ لسانیات نے لفظ "تہذیب" کے مختلف معنی و مفہوم نکالے ہیں۔ ان کی رو سے "Culture" لاطینی لفظ "Cultra" سے مشتق ہے، جس کے لغوی معنی کاشت کے ہیں۔ یعنی " بہ صورت صیغۂ فعل، زمین کو کھیتی باڑی کے لیے تیار کرنا ہے"۔ ۶؎ اور مرادی معنی: "سنوارنے، ترقی دینے، ذوق پیدا کرنے کے ہیں"۔ ۷؎ اسی طرح اردو میں تہذیب کے لغوی معنی: "پاک کرنا اور آراستگی ہیں"۔ ۸؎ فارسی لغت نے بھی تہذیب کے مفہوم: "پاکیزہ کردن، خالص کردن یا اصلاح کردن"۔ ۹؎ قرار دیے ہیں۔ خود عربی میں بھی: "خضادة، ثقافة، ادب" ۔ ۱۰؎ کے معنی میں عموماً استعمال کیے جاتے ہیں۔ مصنف "بیان اللسان" نے تہذیب کے معنی اس طرح تحریر کیے ہیں:

"پاکیزہ کرنا، درستی و اصلاح کرنا، بے کار حصہ کو نکالنا، تعلیم و تربیت، اصلاح، شائستگی"۔ ۱۱؎

اور لغات کشوری میں تہذیب کے معنی "آراستہ کرنا، پاک کرنا، کسی چیز کو اصلاح دینا"۔ ۱۲؎ ہیں۔ سنسکرت شبدارتھ کوستبھ کے مصنف لالہ رام نرائن لال نے لفظ سنسکرتی کے معنی درج کرتے ہوئے لکھا ہے:

"صاف کیا ہوا، شدھ کیا ہوا، دھو مانجھ کر شدھ کیا ہوا، سدھایا ہوا، سدھارا ہوا، پرشکرت کیا ہوا"۔ ۱۳؎

اسی طرح بھارگو دوش ہندی شبد کوش میں سنسکرتی کے معنی کچھ اس طرح تحریر ہیں:

"سنگار، سدھار، پرش کار، شدھی، سجاوٹ"۔ ۱۴؎

اور نیو آکسفورڈ السٹریٹڈ ڈکشنری میں کلچر کے معنی ہیں:

" Improvement of refinement of mind, manners etc, by education and traning, condition of thus being trained and refined, particuler from of or type intellectual development of civiliztion" ۱۵؎

اوپر درج کی گئی باتوں سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ تہذیب وہ ہے جس میں ماحول کو صاف ستھرا اور آراستہ کر کے اس قابل بنایا جاتا ہے جہاں کوئی قوم اپنی فکری، ادبی، مذہبی اور سماجی غذا کی کاشت کر سکے۔ جمیل جالبی "قومی انگریزی اردو لغت" میں تہذیب کی تعریف اس طرح بیان کرتے ہیں:

"ثقافت، تہذیب، کلچر، کاشت، گروہ یا فرد کی اکتسابی اہلیت یا

قابلیت جس کے ذریعہ وہ عام طور پر مسلمہ جمالیاتی اور ذہنی ذوق کی شناخت اور تحسین کرسکتا ہے۔تہذیب کا جمالیاتی اور ذہنی حاصل، کسی قوم یا عہد کے حوالے سے تہذیب کا ایک خاص ارتقائی درجہ یا حالت''۔۱۶؎

یعنی تہذیب صرف اکتساب کے ذریعہ جمالیات کومختلف احساسات کے ساتھ سمجھنے کا نام ہے، نامکمل تعریف ہے۔ کیوں کہ اگر صرف محسوسات اور ذوقِ تحسین ہی تہذیب کو پروان چڑھانے میں معاون ہوتے تو دیگر معاونین جن سے سماج، تمدن وثقافت جوتہذیب کا حصہ ہیں، جن میں ٹھوس بنیادی حقیقتیں شامل ہیں وہ کہاں رکھی جائیں گی۔ دراصل تہذیب انسان کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے اوراس کا ایک عنصر تمدن بھی ہے۔

تمدن جس کی بنیاد شہریت اور مادّیت پر مبنی ہے وہیں تہذیب کی جڑیں معاشرے کے رگ و ریشہ میں پیوست ہوتی ہیں۔ اگر اس میں تبدیلی لانے کی یکدم کوشش کی جائے تو زندگی کا پورا نصب العین اور تصورِ حیات بکھر کر منتشر ہونے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تہذیب جس طرح صدیوں پر محیط ہوتی ہے اسی طرح اس میں ترمیم بھی ایک لمبے عرصے کے بعد ہو پاتی ہے۔مشہور مورخ ٹائن بی نے اپنی کتاب Study of History میں اکیس تہذیبوں کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''تہذیبیں ایک سال یا دوسال میں نہیں بلکہ سینکڑوں سال بعد وجود میں آتی ہیں''۔۱۷؎

اور یہ صدیوں کی دوری واقعات اور تجربات سے گھری ہوتی ہے۔ پھر زندگی کا ہر واقعہ اور تجربہ اپنے پس منظر میں ایک پوری تاریخی حقیقت سے لبریز ہوتا ہے۔ وہ تاریخ جس میں حالات کے تذکروں کے ساتھ ردِعمل اور سماجی سطح پر ہونے والی تبدیلیاں بھی رقم ہوتی ہیں۔ ابن خلدون نے جہاں تاریخ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ'' تاریخ ایک خاص زمانہ یامخصوص قوم کے حالات کوقلم بند کرنے کا نام ہے''۔۱۸؎ وہیں وہ تمدن کی تعریف کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

''حضریت'' دراصل ضرورت سے زائد ایک عادت اور حالت کا نام ہے۔ یہ ایک حالت پر قائم نہیں رہتی، بلکہ خوشحالی اور قوموں کے گھٹنے بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ جب شہریت اپنے

مختلف و گوناگوں اقسام و اصناف کے شہر میں رائج ہو جاتی ہے تو
صنعتوں کو فروغ ہوتا ہے۔ قسم قسم کے ماہر و مشاق کاریگر و صنعت گر
پیدا ہو جاتے ہیں جو اپنی صنعت سے اہلِ شہر کا رُخِ زندگی اور مذاقِ
طبع بدل ڈالتے ہیں۔ اب جس قدر تمدن سے لوگوں کے مذاق
بدلتے ہیں اور پیش از پیش ہوتے ہیں اسی قدر طرح طرح کی صنعتیں
عالمِ ظہور میں آتیں اور فروغ پاتی ہیں"۔ ۱۹

اس کے علاوہ ہندوؤں کی قدیم ترین مقدس کتاب یعنی وید (یجروید) میں 'سنسکرت' لفظ ملتا ہے۔ مگر جس کی وضاحت نہیں ملتی۔ جب کہ بعد میں تحریر کیے جانے والے اپنشدوں میں تفصیل کے ساتھ تہذیب کے معنی و مفہوم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی کہا گیا ہے کہ تہذیب ان تمام نصب العینوں کا مرکب ہے جو آدمی کو انسانی نظر عطا کرتی ہے۔ یہ انسانیت سے لبریز نظر زندگی کے تمام کاروبار اور سماجی تعلقات میں موجود رہتی ہے۔

قرآن مجید میں بھی بار بار انسان اور انسان کی تہذیب کے مکمل اشارے ملتے ہیں، جو اس کی تمام حیات و عمل پر محیط ہیں۔ ایک ایسی مکمل تہذیب جو معمولی چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، موت و زندگی کے ساتھ ساتھ زندگی کے ارتقاء اور اس کے ہر پہلو پر محیط ہے۔

علاوہ ازیں مختلف ماہرینِ لسانیات و بشریات نے تہذیب (Culture) کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں، جس سے تہذیب کی مختلف جہتوں کا پتہ چلتا ہے۔ Encyclopedia of religion and ethic میں تہذیب کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> " The notion of culture may be broad enough to express all forms of spiritual life in a man intellectual religious, ethical. It is best understood intensively as humanities effort to assert its inner and independent being" ۲۰

یعنی تہذیب انسان کی روحانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرتی ہے۔ اس میں اپنے ملک کے پُرشکوہ خیال اور جذبات شامل ہوتے ہیں۔ Encyclopedia of Social Sciences کے مطابق تہذیب:

> " Culture comprises in herited artifates goods.

Technical progress, Ideas, habits and values."[۲۱]

وہیں آگے چل کر بیان کیا گیا ہے:

" Culture is then essentially an instrumental reality which has come in to existence to satisfy the head of man in manner for surpassing any direct adoptation to the environment" [۲۲]

یعنی انسان کو قومی وراثت سے جو حق، تکنیک، خیالات، جذبات، روزمرہ کے معمولات جیسے رہن سہن کا طریقہ سلیقہ حاصل ہوتا ہے وہ سبھی تہذیب کے تحت آتے ہیں۔ انسان چند چیزوں کو ہی سیدھے طور پر حاصل کرسکتا ہے قدرت سے ملنے والی سبھی چیزیں سیدھے کسب نہیں کی جاسکتیں بلکہ ان کو تغیر و تبدل کے ساتھ تہذیبی ڈھانچے میں تبدیل کر کے قبول کیا جاتا ہے۔ یہیں پر اکتفا نہ کر کے تہذیب کو پھر دو زمروں میں بانٹا ہے اول مصنوعات اور دوئم رسومات:

" Culture is a well organised unity divided into two fundmental aspect a body of artifacts and system of customs."[۲۳]

جب کہ E. B. Tylor نے کلچر کو "Comlex whole" قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق:

" Culture is that complex whole which includes knowledge, belief, art, morals, law, custom and other capabilities reqevired by man as a member of society."[۲۴]

یعنی تہذیب وہ پیچیدہ نظام ہے جس میں علم، یقین، (عقیدہ) فن (آرٹ)، اخلاق، قانون، رسومات اور انسان کی دیگر صلاحیتیں اور عادات شامل ہیں جو فرد خود سماجی رکن کی حیثیت سے حاصل کرتا ہے۔

جدید دور میں ''تہذیب'' کی اصطلاح ماہر لسانیات سر ایڈورڈ ٹیلر نے ہی سب سے پہلے دی ہے اور اس میں کسی حد تک داخلی و بیرونی اقدار کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے، مگر انسان کی زندگی کے چند پہلوؤں کو چھوڑ گئی ہے جس کی وجہ سے ان کے یہاں تشنگی کا احساس باقی رہتا ہے، جیسے جغرافیائی حدود، آب و ہوا، تاریخ، فکر، نصب العین، زبان اور مذہب، اگر مذہب کو belief کے تحت رکھیں تب بھی اس کے معنی کو اور زیادہ وسعت دینی ہوگی۔ جب کہ Malinowski تہذیب کی تعریف اس طرح بیان کرتے ہیں:

" Culture in the handiwork of man and the medium through which he achieves his ends"[۲۵]

اس تعریف میں تہذیب کے روحانی اور کسی کے ساتھ اخلاقی پہلو بھی نظر نہیں آتے۔ یہ خیالات کسی حد تک مارکس سے مطابقت رکھتے ہیں، جن کا خیال ہے ہر چیز مادہ سے پیدا اور مادہ کی وجہ سے ہی وجود میں آتی ہے۔ اسے ہم تہذیب کی نہ کہہ کر تمدن کی تعریف قرار دے سکتے ہیں۔ Maciver تہذیب اور تمدن کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> " Civilization is what we have and culture is what we are"۲۶

مگر انسان کی حیثیت سے انسان، انسانی خواہشات، ضروریات، فہم و ادراک میں اتنے جدا ہیں کہ سینکڑوں مثالیں پیش کرنے کے باوجود مکمل تعریف کرنے سے قاصر رہیں گے۔ R. Redfield کے مطابق:

> "Culture is an organised body of conventional under standing manfest in art and artifacts. Which presisting through tradition, charectorized a human group."۲۷

یعنی ''انسانی تہذیب مصنوعات اور قواعد کے تحت رہتی ہے اور انسان ماضی سے ہی سب کچھ حاصل کرتا ہے''، مکمل سچائی نہیں ہے۔ وہ حال سے بھی بہت کچھ حاصل کرتا ہے جس سے اس کے موجودہ اقدار کو اور تربیت حاصل ہوتی ہے اور ساتھ ہی مستقبل کے اچھے امکانات بھی روشن ہوتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹینکا میں تہذیب کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے:

> " Culture became a term used to describe the distinictive human mode of adapting to the environment molding nature to conform to man's desires and goals... Culture consist of the learned way of behaving and adapting as contrasted to in herited behavior pattorn's or instinets."۲۸

مطلب یہ کہ انسان جو کچھ ماحول سے حاصل کرتا ہے، ماحول کے مطابق ڈھالتا ہے۔ اپنی خواہشات اور ضروریات کی تکمیل کرتا ہے، سیکھتا ہے اور اسے اپنے روز مرہ میں شامل کرتا ہے وہی تہذیب ہے۔ لیکن تہذیب تو سیاسی، جغرافیائی حالات سے بھی جھوجھتی ہے اور اخلاقی نظام بھی بناتی ہے۔ مختلف رنگ و نسل کے لوگ جو مل کر ایک قوم بناتے ہیں ان سب کی تاریخی، مذہبی اور سماجی ضروریات کو بھی مدنظر رکھتی ہے۔ ''فلپ باگبی'' کا اپنا نظریہ ہے وہ کہتے ہیں:

" Culture is a particular class of realities of behavior. It includes both internal and external behavior. It exclude the biologically is herited aspects of behavior."[۲۹]

یعنی انسانی رویوں (عادات) کے تمام خاص الخاص کردار تہذیب کے تحت آتے جاتے ہیں۔ یہ رویے داخلی یا خارجی دونوں ہو سکتے ہیں یہ کسبی (ولدیت) اور علم اجسام میں شمار نہیں کی جاسکتی۔ فلپ بالی کا نظریہ یہاں کمزور ہو جاتا ہے کہ تہذیب میں جس طرح آب و ہوا اور جغرافیائی عناصر ناگزیر کردار ادا کرتے ہیں اسی طرح ایک سماج میں رہنے والے کسی بھی قوم کے افراد کی تہذیب صرف فرد کے اپنے کردار اور رویوں کے تحت نہیں بنتی بلکہ حقیقتاً بہت کچھ رویے کسب کیے جاتے ہیں، جو ورثے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یہ ورثہ ان تمام اقدار پر مشتمل ہوتا ہے جو وہ ان تمام افراد کی رفاقت، پرورش، تجربوں کے اثرات کے تحت اپنے اندر مقیم رکھتا ہے، وہیں Cultural Sociology میں جان لوئس کا خیال ہے کہ تہذیب:

" The customs the tradition, attitudes, ideas and symbols which govern social behavior show a wide variety. Each group each society has a set of behavior patterns (overt and covert) which more or less common to the members, which are passed down from genration to genration to children and which one constantly liable to change. These common patterns call the culture."[۳۰]

حاصل یہ کہ اخلاق واطوار، رسومات، رواج، نظریے، جذبات اور دیگر سماجی رویے بہت سے عناصر قبول کرتے ہیں۔ یہ سب ہر ایک سماج میں ایک منتخب طریقے اور روایات، اقدار کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ اقدار سماج کے سبھی افراد کی وراثت ہوتے ہیں۔ ان سبھی مروج اور قبول واخذ کیے گئے رویوں کو اپنانے کی تکنیک کا نام ہی تہذیب ہے۔ طبقوں اور انسانوں کے آپسی تعلقات اور ان کے تمام متوقع رویے عام شکل میں قبول ہو کر تہذیب کی تصویر بناتے ہیں۔ پھر لکھتے ہیں:

" It is the possession of common culture which gives the members of a society a feeling of unity with the group and enables. Then to live and work together without to mouch confusion and

mutual interference."[۳۱]

یعنی تہذیب انسانی سماج میں یک جہتی کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور بنا کسی الجھن اور روک ٹوک کے اپنی حیثیت سے کام کرنے کی طاقت فراہم کرتی ہے۔ پہلی تعریف واضح اور کسی حد تک روحانی و سماجی نقطہ سے مکمل ہے تو دوسری مختصر اور تہذیب کے صرف ایک رُخ کو ہی سامنے لاتی ہے، جب کہ تہذیب صرف ایک جذبہ کا ہی نام نہیں ہے۔ جب کہ رالف لٹن The cultural background of personality میں رقم طراز ہیں:

" A Culture is the configuration of learned behavior and results of behavior whose component elements are shared and transmitted by members of a particular society."[۳۲]

اس کے یہ معنی ہوئے کہ تہذیب تمام کسبی، روایتی رویوں اور ان کے نتائج کی ہیئت ہے، جس کے مختلف اجزاء منتخبہ سماج کے ممبروں کے ذریعہ قبول اور منتقل کیے جاتے ہیں۔ یہاں ان اقدار کی بات کی جارہی ہے جو کسب کیے جاتے ہیں اور اپنے اسلاف سے اپنے اخلاف تک پہنچائے جاتے ہیں۔ جب کہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کے مطابق '' زندگی کے مختلف اور قریبی مسئلوں پر کیا گیا غور وفکر اور اس کو بیان کرنا بھی تہذیب ہے''۔

" It (Culture) is thinking with one's whole mind and body. It is making entire organism sense and sensibility mind and understanding thrill with idea."[۳۳]

وہیں "The centre of india culture" میں رویندر ناتھ ٹھاکر'' تہذیب کو زندگی کا دماغ''[۳۴] قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح M. J. Herkovits کے الفاظ میں'' انسان ایک تمدن ساز حیوان ہے''۔[۳۵] (Culture bulding animal)۔ اور ہوبُل کا کہنا ہے کہ'' تہذیب مخصوص انسانی ماحول ہے''[۳۶] (Culture is a uniovualy human phennomenon)۔ ہرسکووٹز کے خیال میں '' ماحول کے انسانی تخلیق کردہ جز کا نام تہذیب ہے'' اس طرح ماہرین نے تہذیب کی مختلف اور متعدد تعریفیں پیش کی ہیں، مگر کسی بھی تعریف کو حرفِ آخر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جس طرح زندگی متحرک، متنوع اور ارتقا پذیر ہے اسی طرح انسان کی تہذیب بھی ہے۔

جب کہ ماہرِ انسانیات اور ماہرِ معاشیات کے نزدیک تہذیب کے الگ ہی معنی ہیں۔ ان کے

نزدیک یہ ایک سسٹم ہے اقدار کا، جہاں سماج، اعتقادات، علوم، رسوم اور تکنیک کا باہم مروج ہونا یا سارے سماج کا ان پر متفقہ طور پر عمل کرنا اور یہی عمل عملی تہذیب ہے۔ رالف لٹن کے الفاظ میں:

''تہذیب عقائد، جذبات، عادات، اداروں اور علامات کا مجموعہ ہے، جو ایک گروپ کے افراد کے کردار اور ان کے ردِ عمل کو متعین کرتا ہے۔ اس پر جغرافیائی اور تاریخی حالات کا نیز معیارِ زندگی، تعلیم، زبان اور ادب سب کا اثر پڑتا ہے''۔ ۳۷

کافی حد تک جامع تعریف ہے۔ پھر انسان کا اپنا ایک مطمعِ نظر ایک نصب العین ہوتا ہے۔ جب یہ نصب العین کسی قوم کی مکمل زندگی کا حاطہ کرتا ہے اور جسے متفقہ طور پر اپنا بھی لیا جاتا ہے، تب وہ تہذیب کے دائرہ میں آجاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں بقول ڈاکٹر سید عابد حسین:

''تہذیب نام ہے اقدار کے ہم آہنگ شعور کا جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے، جسے وہ اجتماعی ادارات میں ایک معروضی شکل دیتی ہے، جسے افراد اپنے جذبات، رجحانات، اپنے سبھاؤ اور برتاؤ میں اور ان اثرات میں ظاہر کرتے ہیں جو وہ مادّی اشیاء پر ڈالتے ہیں''۔ ۳۸

افراد کے ذریعہ جب مادّی اشیاء پر اثرات ڈالے گئے تب ہم نے اسے تمدن کا نام دے دیا۔ یعنی تمدن ایک چھوٹا حصہ ہے تہذیب کے بطن سے پیدا ہونے والا ایک اہم حصہ، جسے ہم کسی بھی قوم کے ارتقاء ذہنی و مادّی کا نمائندہ کہہ سکتے ہیں۔

کسی بھی تہذیب کے اجزائے تعمیر میں نہ صرف وہ طبقہ جو خواص کہلاتا ہے بلکہ عام یا متوسط اور نچلہ طبقہ بھی اہم کردار نبھاتا ہے۔ اسی لیے ایک جغرافیائی حدود میں رہنے والے لوگ ایک قانون، مذہب، سیاسی، معاشی وسماجی اور معاشرتی ادارے قائم کر کے اس میں اپنا یقین اور اعتماد ظاہر کرتے ہیں۔ اور اپنے لیے راہ متعین کرتے ہیں، جس کے تحت انھیں نہ صرف زندگی گزارنی ہے بلکہ کس طرح انھیں اپنا کر خود کو بلندی پر لے جانا ہے۔ دنیا کی باقی اقوام کی نگاہوں میں مہذب، طاقت ور، بے مثال ثابت کرنا، بلکہ ان کی تہذیب کی بہ نسبت اپنی تہذیب کو ترقی یافتہ اور مکمل صورت میں پیش کرنے کی ایک خاص سوچ ہوتی ہے۔ ان خامیوں پر بھی نظر ڈالی جاتی ہے جو دوسری تہذیبوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ حالاں کہ اس سے مہذب قوم انفرادی نظریے کی حامل بن جاتی ہے۔ مگر خود اتنی بلند ہو جاتی ہے

کہ کمزور تبدیلیوں کو یا تو فنا کی حد تک پہنچا دیتی ہے یا پھر اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ کسی بھی تہذیب پر اس کے مذہب کا بھی خاص اثر ہوتا ہے۔ معاشرہ مذہبی تصور کے پس منظر میں رسوم، عقائد، طرزِ معاشرت، سماج اور کچھ قوانین، فنونِ لطیفہ اور ادب کی تخلیق کرتا ہے۔ اس کی تعمیرات سے لے کر اس کے اقوال تک اسی سے متاثر ہوتے ہیں یہاں تک کہ ان کا فلسفہ بھی کسی حد تک مذہب، اجتماعی فکر اور ضرورت کو ظاہر کرتا ہے۔

تہذیب کو ہم سہل انداز میں سمجھنے کی کوشش کریں تو وہ دراصل ہماری عادات کے مجموعے کا نام ہے۔ یعنی ان مادّی و غیر مادّی دونوں کے باہم مجموعے کا نام ہے، جس میں زبان، سوچ، فکر، اقدار، مکان، لباس، آلات، اخلاق، احساسات، طرزِ عمل، سیاست، آب و ہوا، تعمیرات سے تحریکات وغیرہ تک ملتی ہیں۔ جس سے مصنوعات کی تشکیل میں مدد ملتی ہے اور پھر یہ مصنوعات خود تہذیب کا حصہ بن جاتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کا اقرار اور اسے زندگی کا حصہ خاص و عام کے ذریعہ بنا لیا جاتا ہے۔

دراصل انسان ایک سوسائٹی کا حصہ ہوتا ہے۔ جس کو وہ خود تشکیل دیتا ہے، اسی میں پلتا بڑھتا ہے، کھانے پینے پہننے اور گفتگو کرنے جیسے دیگر ضروری کام انجام دیتا ہے۔ جب وہ اپنے ماحول، ضرورت اور جذبہ کے ساتھ تمام کام پوری ایمانداری اور خلوص سے انجام دیتا ہے تو اس کا عمل ایک مہذبانہ عمل ہوتا ہے۔ یہ عمل اخلاقی، مذہبی اور سماجی و معاشرتی نقطہ سے انجام دے کر آنے والی نسل کے لیے بھی ایک نمونہ چھوڑتا ہے جو اپنے ماحول اور ضرورت کے تحت ان میں کبھی بالکل اسی طرح اور کبھی چند چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کے ساتھ ان پر عمل کرتا ہے، یہی تہذیب ہے۔ پیدائش کے سبب ہی ہم کسی تہذیب کو مکمل نہیں اپناتے ، بلکہ جس ماحول میں پرورش پاتے ہیں یا جو عمل اور ردِ عمل دیکھتے ہیں غیر ارادی طور پر ہم اسے اختیار کر لیتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جنھیں ہم زندگی کے تجربوں سے حاصل کرتے ہیں۔ ایسے اقدار ٹھوس حقائق پر مشتمل ہوتے ہیں۔

ماہرین نے تمام مباحث سے ہٹ کر کئی باتوں پر اتفاق کیا ہے جنھیں ہم تہذیب کے عنصر کہہ سکتے ہیں۔ جیسے نشانِ خاص، زبان، اقدار، رائج باتیں، قانون، تکنیکی اور مادّی اشیاء۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے اسے اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ وہ کون سی بات صحیح تسلیم کرے اور کن پر عمل کرے گا یا کسے غیر مہذبانہ قرار دے کر رد کر دے گا۔ ان سب کو سیکھنے کے لیے اسے اُن عناصر کو سیکھنا پڑے گا جن کی بنیاد پر وہ کسی سماج کا مہذب انسان کہلا سکے۔

نشانِ خاص (Symbols) تبھی وجود میں آتے ہیں جب ذہن تخلیقی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ اشارے ایک ایسی حرکت، لفظ یا اعداد ہوتے ہیں جن سے خاص مقاصد کی طرف نشاندہی کی جاتی ہے۔

زبان اشارات کا مجموعہ ہے۔ انسان کے لیے زبان ایک ایسا طریقۂ کار ہے جو بات کو سمجھانے اور سمجھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ ہمارے جو بھی اعقان، رسومات، اعتقادات و مروّجات ہوتے ہیں ان کو ایک سے دوسرے تک پہنچانے اور سمجھانے کا زبان ایک موثر طریقہ ہے۔ انسانی سماج چاہے کسی بھی سرحد میں واقع ہو اس کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔ ہزار ہا زبانیں رائج ہونے کے باوجود ایک لفظ کا ردِ عمل دوسری زبان میں بھی وہی ہوگا جو ایک زبان میں ہے۔ مان لیجیے اگر جانے کے لیے کہا جائے تب ''رفتی''، ''جاؤ''، "Go" کا ردِ عمل جانا ہی ہوگا نا کہ بیٹھنا یا کودنا۔ زبان چوں کہ کسی بھی سماج یا انسانی ماحول کے لیے ایک بنیادی چیز ہے۔ اس لیے عام طور پر لوگ اسے سنجیدگی سے نہیں لیتے اور نہ ہی کلچر پر لکھتے ہوئے اسے بنیاد بناتے ہیں۔ ہم صرف اندازے لگاتے ہیں۔ مگر اس کا ماخذ یا عادتیں زبان کے حوالے سے ایک ہی ثابت ہوتی ہیں۔ دراصل تشکیلِ تہذیب اور اقدارِ تہذیب کو بنانے اور ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچانے کا واحد اور پر اعتماد ذریعہ زبان ہی ہے۔ زبان کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جہاں زبانوں کا زوال ہوا وہاں تہذیبوں کے ''سوتے'' بھی خشک ہو گئے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تہذیبی زوال کے سبب زبان کو بھی زوال کا سامنا کرنا پڑا ہو، مگر زبان سے ہی تہذیبی ادوار قائم کیے جاتے ہیں۔ جس طرح فارسی جدید، فارسی قدیم اور فارسی بابلی ہے۔ زبان کے سانچوں میں تہذیبیں بھی ڈھل جاتی ہیں، جیسے موجودہ زمانے میں انگریزی زبان، غیر انگریزی ملکوں میں انگریزی اور امریکی تہذیب شدت کے ساتھ اپنے تہذیبی اثرات چھوڑ رہی ہے اور جس طرح انگریزی اہم قرار دی جا رہی ہے اس کے ساتھ تہذیبی اقدار بھی اپنی جڑ مضبوط کر رہے ہیں۔

اقدار دراصل اچھے و بہتر اور خراب یا غلط کو سمجھنے کا پیمانہ ہوتے ہیں۔ لوگوں کے ذریعہ سماج میں کیا اہم ہے اور کیا مفید اس کا فیصلہ اپنے اقدار کی کسوٹی پر پرکھ کر کرتے ہیں۔ اقدار کے دو پہلو ہوتے ہیں مثبت اور منفی۔ مثبت اقدار ہمارے اچھے اور منفی ہمارے اُن اقدار کے متعلق ہوتے ہیں جنھیں سماج اپنانے سے ہمیشہ انکار کرتا رہا ہے۔ مثبت اقدار ہمارے جذباتی احساسات سے جڑے ہوتے ہیں کیوں کہ ہم کو یقین ہوتا ہے یہ معیاری ہیں اور ان کی حفاظت کرنا نہ صرف ضروری ہے بلکہ ہمارے

فرائض میں بھی شامل ہے۔ جہاں یہ اقدار ہماری تہذیب کا حصہ ہوتے ہیں وہیں ایک سماج کا دوسرے سماج سے فرق کرنے کا بھی ذریعہ ہیں۔ جس طرح ایک انفرادی خاندان مغربی اقدار کا حصہ ہیں اسی طرح اجتماعی خاندان کو مشرق میں اہمیت حاصل ہے۔

جو باتیں ایک سماج ہم سے چاہتا ہے جو ہماری شخصیت یا عادات کے اصول مقرر کرتا ہے کہ ہمیں ایسا نہیں ہونا چاہیے یا ویسے ہم ہوں۔ وہی امیدیں رواج (Norms) کہلاتی ہیں۔ کیا کرنا ہے کیا نہیں۔ کیسے کرنا ہے، کیسے نہیں۔ جو ہمارے لیے Guide Line مہیا کرتی ہیں وہ تہذیب کا ہی ایک مضبوط حصہ ہوتی ہیں۔

اسی طرح قانون کسی بھی تہذیب کو سمجھنے کا ایک موثر طریقہ ہے۔ جب اقدار یا رواج یا دونوں جسے سماج یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ سب کے لیے مفید اور قابلِ تقلید ہے تو وہ آگے چل کر قانون کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ جب حسبِ ضابطہ اور معیاری طریقے سے ان اقدار کو مجلسِ قانون ساز باقاعدہ تحریر یا اعلانیہ نافذ کرتا ہے تب وہ عادات جنھیں سماج نے بہتر، مناسب اور قابلِ عمل قرار دیا قانون بن جاتے ہیں۔ توڑنے اور عمل نہ کرنے کی صورت میں مجلسِ قانون ساز سزا تجویز کر سکتی ہے اور سزا دینے کے اصول بھی بناتی ہے۔

اِن تہذیبی اجزاء کو اخلاقی، روحانی یا غیر مادّی تہذیبی عناصر کے تحت بھی رکھ سکتے ہیں۔ مگر جب تکنیک اور مادّی اشیا کا ذکر آتا ہے تب وہ تہذیب کے مادّی اجزاء یا عنصر کہلاتے ہیں۔ انھیں کو ماہرین نے تمدن کا نام دیا ہے۔ دوسری جانب جسے ہم تہذیب کہتے ہیں اپنی تاریخی، جغرافیائی، مذہبی عقیدوں، اشارات اور ضروریات کے مطابق بنتی ہے۔ اس کا عمل، ردِعمل اس کے اپنے بنائے گئے قوانین کے بموجب ہوتے ہیں۔ ماضی میں ارتقاء کی بلند پرواز کرتی تہذیبیں بھی تھیں تو کچھ لمحاتی سانس لے کر آئی تھیں۔ حال میں تو تہذیبیں اس طرح ایک دوسرے میں پیوست ہو رہی ہیں کہ انھیں جدا کر کے دیکھنا ایک مشکل مرحلہ ہے۔ مستقبل بھی کسی حد تک ہم پر پوشیدہ کم اور عیاں زیادہ ہے۔ پھر بھی ہم ایسی کوئی پیشن گوئی نہیں کر سکتے جو وضاحت طلب نہ ہو۔ سب کچھ حالات پر انحصار کرتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ کچھ زنجیریں ٹوٹیں گی اور کچھ نئی تشکیل پائیں گی۔

مجموعی طور پر دیکھیں تو مقامی اور علاقائیت سے ہٹ کر تہذیب و تمدن یا ثقافت انسان کے آفاقی تجربے کا نچوڑ ہے، جس میں لگاتار حرکت اس کی زندگی کی گواہ ہے۔ وہ انسانیت کی نہ صرف راہ متعین

کرتا ہے بلکہ فکری جہات کی طرف راغب بھی کرتا ہے۔فرد اور تہذیب دونوں کا عروج وزوال ایک دوسرے پر انحصار کرتا ہے۔اسی سلسلے میں عبدالمغنی ''تصورات'' میں صراحت کرتے ہیں کہ:

''تہذیب کے لفظ میں تعمیر، صالح اور خیر کا مفہوم مضمر ہے۔تہذیب ایک جملے میں عادات و اوطوار کی درستگی کا نام ہے، جسے دوسرے لفظوں میں خوش خلقی اور شائستگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے''۔۳۹

اور محمد حسن کا خیال ہے کہ تہذیب:

''جذبے، احساس اور فکر کے مجموعی رویّے کا نام ہے۔ یہ رویّے حالات کے جس قدر زیادہ مطابق اور اعلیٰ ترین اقدار سے جس قدر زیادہ ہم آہنگ ہوگا اسی قدر سماج زیادہ مہذب ہوگا۔تہذیب آرنلڈ کے نزدیک باطنی ڈسپلن ہے اور یہ باطنی ڈسپلن فرد کے احساسات، جذبات و افکار کے صحیح توازن سے پیدا ہوتا ہے۔ اس توازن کی تربیت جمالیات سے ہوتی ہے''۔۴۰

جب کہ مولانا مودودیؒ دنیا کی ہر تہذیب کو پانچ عناصر کا مجموعہ خیال کرتے ہیں۔فرماتے ہیں:

''تہذیب جس چیز کا نام ہے اس کی تکوین پانچ عناصر سے ہوتی ہے۔ (۱) دنیوی زندگی، (۲) زندگی کا نصب العین، (۳) اساسی عقائد و افکار، (۴) تربیتِ افراد، (۵) نظامِ اجتماعی''۔۴۱

عبدالمغنی اور محمد حسن کا رویہ اخلاقی نقطۂ نظر رکھتا ہے جو تہذیب کے صرف ظاہری پہلو کو ہی دیکھنے میں معاون ہے جب کہ مودودی صاحب نے اپنے تکوین میں تہذیب کا احاطہ کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔آل احمد سرور کہتے ہیں: ''کلچر دراصل اجتماعی مسرت ہے'' اور بقول راج گوپال آچاریہ ''کلچر ضبطِ نفس کا نام ہے''، احتشام حسین کے مطابق ''تہذیب ایک ملک کے فنونِ لطیفہ، ادب، فلسفیانہ خیالات، طرزِ معاشرت، مادّی ترقی اور زندگی کے متضاد و متصادم عناصر کو متوازن بنا کر اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی کا ایک خوشگوار احساس پیدا کرنے کے علاوہ کوئی چیز نہیں''۔تہذیب کو صرف مسرت اور خوشگوار احساس کہہ دینا دراصل تہذیب کے صرف جمالیاتی پہلو پر ہی نظر ڈالنا ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ تہذیب کی تعمیر میں اپنے دور میں ہر شخص کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لیتا ہے۔تہذیب ماضی کے تجربات اور حال کے تغیرات

سے مستفیض ہوتی ہے۔

جہاں یقین، عقیدہ، نصب العین زندگی کی اہم قوتیں ہوں وہاں مادّی وسائل اور محنت سے ہم تہذیب کا محل تعمیر کرتے ہیں، جس میں سیاسی شعور، سماجی آگاہی، مذہبی رواداری اور اخلاقی نظام سے نقش ونگار بنائے جاتے ہیں۔ مالی نوسکی اگر یہ کہتے ہیں کہ ''مادّی وسائل اور ان کی قدرت ہی تہذیب کا محور ہے'' تو میتھیو آرنلڈ کے مطابق ''کلچر تکمیل کی سعی ہے، یہ روشنی کی تلاش ہے''۔ لینڈ کا یہ خیال کہ ''تہذیب ایک داخلی و روحانی چیز ہے اس کا انحصار آزادی اور خدمت کے تصورات کے ادراک پر ہے''۔ ہمارے سامنے روحانیت اور مادیت کے پہلو اجاگر کرتا ہے۔ جب ڈاکٹر عابد حسین تہذیب کی تشکیل کے متعلق لکھتے ہیں:

''طبعی ماحول اور فوق طبعی تصورات یا عقائد دونوں کے اثرات مل کر تہذیب کی تشکیل کرتے ہیں''۔ ۴۲

تب بات تصورات اور عقائد سے بھی آگے بڑھ جانی چاہیے کیوں کہ عمل اس میں سب سے اہم ہے کہ آیا ہمارا مشترکہ عمل اس پر ہے یا نہیں۔ اگر ہے تب تو تہذیب کا حصہ ہے ورنہ نہیں۔

ماہرین کے نظر میں تہذیب کو متاثر کرنے والے جو عناصر ہیں انھیں ایک نگاہ میں اس طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ جیسے انسان کا ارتقاء انفرادی و سماجی نظریے سے، زندگی کے نصب العین، انسانی نظریۂ اخلاق، روحانی زندگی، مذہبی فرقے، اہلِ مسائل پر تزئینِ (اصلاح) خیال، اخلاقی ارتقاء، ذہنی ارتقاء، تمدن کا عروج، انسانی رویے، سماجی تعلقات، دماغی قوت، زندگی کی حصولیابی کے طریقے، حیاتی آلہ جات، یقین (اعتماد)، رسومات، روایات، یکجہتی کا جذبہ، دلچسپیاں، فنونِ لطیفہ، احساسِ حسن، ماضی، حال اور مستقبل، آدابِ زندگی و آدابِ روزمرہ وغیرہ۔

دوسری جانب تہذیب کو جغرافیائی حدود کے مطابق چار حصّوں میں تقسیم کر کے دیکھیں تو علاقائی، صوبائی، ملکی اور عالمی تہذیبوں کے ساتھ چار زمروں میں نظر آئے گی۔ انھیں حدود کے مطابق ہمارا ادب بھی متاثر ہوتا ہے۔ تقریباً چاروں ہی تہذیبوں میں کسی نہ کسی طرح ہمارا ادب سانس لیتا ہے اور زندگی پاتا ہے۔

علاقائی تہذیب میں مقامی اطوار و اخلاق، نصب العین، فکر، زبان، سماجی ضروریات و حالات کا مدنظر رکھا جاتا ہے جس کے تحت ان کا رہن سہن، کھانا پینا، رسومات، روایات اور عقائد آجاتے ہیں۔ مگر

یہ صرف علاقائی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس میں ان کا طرزِ عمل، طرزِ زندگی، ان کی خوشیاں، تیوہار، ضعیف الاعتقادی، توہم پرستی، ایقان پر افراد یا اس علاقے کا سماجی گروہ اپنی زندگی کا محور بنالیتا ہے۔

صوبے کے تحت اس طرح کے اور بھی بہت سے علاقے آجاتے ہیں اور وہ صوبہ اپنی زبان، مذہب، رہن سہن، شادی بیاہ، موت وغم کی رسومات میں ہر طرح سے یکسانیت کا حامل ہوتا ہے۔ یہی یکسانیت اس صوبے کے فن وادب وتعمیر میں نمایاں ہوتی ہے۔ جیسے اگر ہم حیدرآباد کے کسی مصنف کا کوئی ناول یا کسی شاعر کا دیوان پڑھیں تو اس میں دکن کے کھانے، پہننے، رہنے اور علاقوں وروایات کے ساتھ وہاں کی تعمیرات اور ان کا طرز خود بہ خود نمایاں ہوگا، جو کسی بھی طرح بنگال، راجستھان یا کشمیر جیسے دیگر صوبوں سے یکسر مختلف ہوگا۔ صوبائی تہذیب میں اس کی تاریخ اور زبان اہم رول ادا کرتی ہیں۔ زبان، جغرافیائی حدود متعین کرتی ہے۔ موجودہ دور میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔

قومی یا ملکی تہذیب زیادہ وسیع ہوجاتی ہے جس میں علاقائی اور صوبائی تہذیب کے وہ عناصر جو یکسانیت کے حامل ہوتے ہیں قومی تہذیب کو متعین کرتے ہیں۔ جیسے عام فہم زبان، مذہب، لباس کا وہ پہلو جو الگ الگ ہو کے بھی وحدت رکھتا ہو۔ مثال کے طور پر ہندوستانی ساڑی، علاقے اور صوبے کے تحت چاہے جس طرح پہنی جاتی ہو مگر ساڑی کی شکل، تصور اور بذاتِ خود کپڑا ایک ہی طرح کا ہوتا ہے۔ اسی طرح مذہب اور اس پر کیا جانا والا یقین اور خاص طور سے زبان کی وحدت۔ بقول عابد حسین:

> ''تہذیب کی تشکیل میں طبعی اور معاشی عناصر کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے.... تہذیبی وحدت کی ایک بڑی علامت مشترکہ زبان سمجھی جاتی ہے''۔ ۴۳

وہیں آگے چل کر لکھتے ہیں:

> ''کسی ملک کی مخصوص اور مشترک تہذیب کا ذکر ہو تو اس سے مراد یہی جغرافیائی اور معاشی حالات اور ان کے اثرات ہوتے ہیں''۔ ۴۴

ان اثرات کے تحت ہی ہر علاقہ مل کر صوبے کی اور مختلف صوبے مل کر ملک کی تہذیب کو ایک شکل فراہم کرتے ہیں، جن میں مشترکہ عناصر کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے۔

عالمی تہذیب یا انسانی تہذیب میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ وہ انسانیت کا مکمل نمونہ ہو یہ تو نہیں کہا

جا سکتا لیکن ہر انسان کی چاہے دنیا کے کسی بھی حصے سے وہ تعلق رکھتا ہو اس کی اپنی داخلی و بیرونی ضروریات وخواہشات ہوتی ہیں جوتقریباً ہر جگہ بنا مذہب وملت یکساں ہوتی ہیں اور یہی یکسانیت عالمی تہذیب اوراس کے عناصر کو متعین کرتی ہے۔

نفسیاتی ،فکری یا فلسفیانہ نقطۂ نظر سے انسان کی اپنی ایک فطرت ہوتی ہے۔ سرسری انداز میں دیکھنے پر ان میں فرق محسوس نہیں ہوتا مگر جب مادّی تحریک دیکھی جاتی ہے تو ہر ملک کا یا قوم کا اپنا طرزِ عمل ،حصولیابی کے طریقے ،نقطۂ نظر ،نصب العین ،اشیائے زندگی کا استعمال اپنی اپنی ضروریاتِ فطرت اور موقع محل کے مطابق کرتے ہیں۔ جہاں تک بنیادی ضرورتوں اور عمل کا تعلق ہے وہ ہر جاندار کے ساتھ ہے اور یہی رویہ ہمیں انسان کے اندر نظر آتا ہے جس سے ایک عالمیت یا عالمی تہذیب کی نمائندگی ملتی ہے۔اس طرح تہذیب کا جو تصور ذہن میں ابھرتا ہے وہ ہے اس کا متحرک اور ارتقاء پذیر ہونا، تہذیب نسل ، زمین، زبان اور مذہب کو سمیٹے ہوئے ہے تو اس سے کہیں زیادہ وسیع بھی ہے۔تہذیب علاقائی ہے تو عالمی بھی ہے۔تہذیب ایک زندہ روح کا نام ہے اسی طرح انسان کے طرزِ عمل میں یگانگت اور وسعت کو بھی ہم تہذیب کا نام دے سکتے ہیں۔ چنانچہ تہذیب کے اس وسیع پس منظر میں جہاں تمدن بھی اس کی ایک ایسی شاخ ہے جس پر مختلف قسم کے ہزار ہا پھل لگے ہیں جن سے انسان اپنی ضرورت کے مطابق عرق حاصل کرتا ہے۔

یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ تہذیب انسان کی اس کے جغرافیائی حدود، آب و ہوا، سیاسی، معاشی و سماجی حالات ، تاریخ ، مذہب ، زبان ، رسوم وایقان اور ان کے روّیوں سے مل کر بنی ہے۔جس میں زندگی سے متعلق روحانی اورارضی دوسرے لفظوں میں مادّی اور غیر مادّی عناصر شامل ہیں۔

انسانی معاشرے کی تشکیل میں بہت سے عناصر کارفرما ہوتے ہیں، جو اپنی اپنی استعداد کے مطابق کام کرتے ہیں اور معاشرے کو ایک مخصوص صورت عطا کرتے ہیں۔ یہ عوامل فکر، مذہب، فلسفہ اور زبان ہیں۔انھیں سے مل کر قوم ایک تہذیب بناتی ہے۔اسی تہذیب کا ایک اہم عنصر ادب ہے۔جس کی ایک شاخ شاعری بھی ہے۔

شاعری صرف انفرادی جذبوں کی ترسیل کا نام نہیں ہے بلکہ شاعری ہے،فرد کے ان احساسات کی جنھیں وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے متاثر ہوکر پر اثر انداز میں عیاں کرتی ہے۔اس میں ماضی کے تجربات، حال کے واقعات اور مستقبل کے امکانات سب کچھ شامل ہوتے ہیں۔شاعری انسان کے

جذبات کو نہ صرف برانگیختہ کرتی ہے بلکہ انھیں وجد میں بھی لاتی ہے، شاعری ہی ہے جو اقوام کے دلوں کو گرماتی ہے۔ ان میں ولولہ و جوش پیدا کرتی ہے۔ شاعری اگر ذہنوں پر خوابیدگی طاری کر سکتی ہے تو انھیں بیدار کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے۔ شاعری نے اگر اقوام کے مزاج کو بگاڑا ہے تو انھیں سنوارنے کا اور اپنا احتساب کرنے کا موقع بھی فراہم کیا ہے۔

شعر و شاعری کا رجحان ہر تہذیب میں نظر آتا ہے۔ وجہ ہے اس کا پُر تاثیر ہونا۔ ایک مقرر کی طویل گفتگو شاید سامع پر وہ اثر نہیں چھوڑتی جہاں شعر کے چند مصرعے اپنا کام دکھا دیتے ہیں۔ شاعری کیا ہے؟ بظاہر چند موزوں الفاظ کا تحریر میں لانا مگر حقیقتاً ایک زندگی کا نچوڑ۔ یہ جذبات میں ہلچل مچا سکتی ہے انسان کو اس کی ذہنی و دلی تکالیف سے نجات دلا سکتی ہے۔ وہ لوگ جو اپنے جذبات کو دلوں میں مقید کر لیتے ہیں اور ناسور بنا لیتے ہیں ان کے احساسات کی اس طرح ترجمانی کرتی ہے کہ بنا اظہار و تفصیل کے یہ ناسور شعروں کے ذریعہ باہر نکل آتا ہے۔

شاعری انسان اور انسانی تہذیب کا اہم حصہ ہے۔ شعر و ادب دراصل انسانی زندگی کا مکمل احاطہ کرتے ہیں۔ بقول ابواللیث صدیقی:

> ''شعر و ادب کی تاریخ ملکوں اور قوموں کی سیاسی تاریخ سے بہت قریب کا تعلق رکھتی ہے۔ چنانچہ شعرا اور ادیب شعوری یا غیر شعوری طور پر انھیں حالات اور واقعات کو بیان کرتے ہیں جن سے ان کو اجتماعی یا انفرادی حیثیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے''۔ ۴۵

اس کا مطلب یہ نہیں کہ شاعر صرف ایک ہی معاشرتی رُخ دکھاتا ہے بلکہ یہ بھی تہذیب کا ایک پہلو ہے، جسے جانے انجانے شاعر یا ادیب اپنی تصنیف میں جگہ دیتا ہے۔ شاعر کو بھی خود عصری حالات سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ وہ انھیں دیکھتا، سمجھتا اور ان کا مقابلہ کرتا ہے۔ نتیجتاً اس کا ماحول اور اقدار اس کی شاعری میں نمایاں ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ''تنقیدی زاویے'' میں لکھتے ہیں:

> ''ہمارا قدیم کلاسیکل ادب ہماری زندگی کی صحیح اور سچی تاریخ ہے۔ ہماری تاریخ کے تین سو سال کے مدوجزر اور تمام نشیب و فراز کی کہانیاں موجود ہیں۔ اس میں قدم قدم پر ہمیں زندگی کی آغوش میں پرورش پائے ہوئے افکار و خیالات، عقاید، نظریات، افتادِ طبع اور

ذہنی رجحانات کی تصویریں ملتی ہیں اور وہ ان سب کا آئینہ دار ہیں''۔۴۶؎

صرف کلاسیکل ادب ہی نہیں بلکہ موجودہ دور کا ادب بھی اپنے ماحول کی سچی تصویریں کھینچتا ہے۔ہم کسی بھی ادیب یا شاعر کو اٹھا کر پڑھ لیں اس کے یہاں عصری آگہی صاف طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔کرب بے بسی، ظلم، انتشار، فرقہ واریت، نفرت، علیحدگی پسندی، جدید اشیاء و آلات، سائنس اور اس کی اصطلاحات، عالمی تحریکیں، ایشیاء و عرب اور افریقہ و یوروپ، رشیا و امریکہ کے مابین سرد جنگیں، کشمکش، ذہنی، مالی و تہذیبی بحران تمام باتیں صاف صاف دکھائی دیتی ہیں۔ بقول نورالحسن ہاشمی:''شاعری اپنے عہد کے طرزِ تمدن و طریقۂ فکر کی آئینہ دار ہوتی ہے''۔۴۷؎ وجہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

''شاعری تمام فنونِ لطیفہ میں لطیف ترین چیز ہے۔ اس لیے سب سے زیادہ اپنے تمدن و تفکر کی ہی آئینہ دار ہوتی ہے''۔۴۸؎

شاعری ایک خوبصورت کلام ہے، مگر پھر بھی وہ معاشرے کا صرف روشن پہلو ہی سامنے نہیں رکھتی ہے۔اس کا غیر جانبدار ہونا اس کی طویل عمری کی دلیل ہے۔ دراصل شاعری انسان کے ذہن و دل کے ساتھ منسلک ہے، جیسا وہ اچھا برا سوچتا یا کرتا ہے وہی سب شاعری میں بھی در آتا ہے۔ ہماری شاعری ہمارے اقدار کے ساتھ ہی چلتی ہے۔ ہمارے اقدار بدلتے ہیں تو وہ بھی بدلتی ہے۔اقدار بلند ہوتے ہیں تو شاعری بھی بلند ہوتی ہے۔اور اقدار تنزلی کی طرف ہوں گے تو خود بخود یہ بھی زوال آمادہ ہو جائے گی۔ دلّی اور لکھنؤ اسکول اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین کا خیال ہے:

''شاعری نے دنیا میں ہر جگہ لوگوں کے بدلتے ہوئے شعور و احساس کا ساتھ دیا ہے تاکہ وہ زندگی سے بے تعلق نہ ہو جائے''۔۴۹؎

یعنی یہ شعر کی فطرت ہے کہ وہ کبھی اپنے وقت اور حالات و افکار دوسرے لفظوں میں اپنی تہذیب سے الگ نہیں ہوتی۔شاعر یا ادیب جس سماج یا معاشرے کا حصہ ہوتا ہے اس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر ہوتا ہے۔اس طرح کسی حد تک ادب سے ہمارا معاشرہ کافی کچھ اثرات حاصل کرتا ہے۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے اس کے داخلی و بیرونی دو پہلو ہوتے ہیں۔انھیں کو بنیاد بنا کر استخراجی و استقرائی دو طریقۂ کار کسی بھی ادبی کاوش کو سمجھنے یا اس کے تہذیبی تناظر کو سمجھنے کے لیے اپنائے جاتے ہیں۔اس ضمن میں ادب کے ساتھ شخصیت، فنّی صلاحیت، نفسیات، معاشرہ، فکر، تعمیر، زبان، سماج، اس

کی روایات، مذہب، سیاسی ماحول، تاریخ، جغرافیہ، نئی ترجیحات بھی زندہ و متحرک اثاثہ و اقدار تمام پہلوؤں کو تکنیکی، سائنسی و اخلاقی کسوٹی پر ناپنا، تولا و پرکھا جاتا ہے۔ اور تب کوئی نتیجہ برآمد کیا جاتا ہے۔ اور وہ بھی حتمی نہیں رہتا۔ گزرتے وقت اور حالات کے ساتھ تہذیب کی بھی تعریف گزرتے تمدنی و ثقافتی تبدیلیوں کے تحت بدلتی رہتی ہے۔

شاعر بھی اپنے سماج کا ہی ایک فرد ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت اس کی بڑھتی ہوئی ذہنی استعداد اور قابلیت اس کے سماجی عمل اور ردِ عمل کے طور پر ہو رہے تمام کام سے وہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ وہ تہذیبی سرگرمیوں اور تمدنی پیش رفت کے بھی اثر میں مستقل آتا رہتا ہے۔ چوں کہ وہ کسی بھی عام انسان سے کسی حد تک زیادہ حساس ہوتا ہے اسی لیے وہ اس پر سب سے پہلے سوچتا ہے۔ غور و فکر کرتا ہے۔ تب ردِ عمل ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ردِ عمل مثبت و منفی دونوں ہوتے ہیں مگر ان کا مقصد تعمیری بھی ہوتا ہے اور انقلابی بھی۔ فرد اور سماج کے آپسی تعلق پر انحصار کرتا ہے کہ تہذیب اور سماج دونوں کا ارتقاء کہاں تک ترقی پا سکتا ہے۔ جب یہ تعلق صحت مند اور مثبت ہوتا ہے تو فرد کی فنی و تہذیبی سرگرمیاں اس کی دلچسپی اور شوق کی تسکین کرتی ہیں۔ اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو تہذیبی اختلافات اجاگر ہوتے ہیں، جس کے سبب اسے قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر سماج کی مہر نہ لگی ہو تو فرد کے وہ کام غیر قانونی اور غیر تہذیبی کہلائیں گے، جن کی وجہ سے فرد اور اس کی سرگرمیاں بے ضرر ہو کر رہ جائیں گی۔ ہماری تہذیب یا سماجی تہذیب بنا اسلحہ اور بنا کرسی کے ایک طاقت ور حکمراں کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں جرم بھی انسان کرتا ہے، سزا بھی وہی دیتا ہے، اچھے عمل کی جزاء بھی آدمی کو حاصل ہوتی ہے۔ مگر قانون اور حکومت اَن دیکھے اُن اقدار کا چلتا ہے جسے ہم نے جانے اور ان جانے خود قبول کر لیا ہے۔

پھر شاعر اور اس کی تخلیق کا مطالعہ کرتے ہوئے اس تحریک یا ترغیب کو بھی نگاہ میں رکھا جانا چاہیے جس کے زیرِ اثر شاعر نے اپنے احساس کو جگایا، جس میں اس کی فکر نے بند دریچوں کو نہ صرف وا کیا بلکہ قاری کے بھی دل و دماغ کو جھنجھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ جس صنف میں عصری آگہی اور تہذیبی روایت کی پاسداری نہیں ہوتی جو اپنے عہد کے تہذیبی رویوں کو نہیں اپناتی وہ تخلیق بے جان اور سابقہ مواد کی تکرار سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اہمیت کی حامل وہی ہوتی ہیں جن میں عصری زندگی کی رمق ہی نہیں بلکہ زندہ، پُر قوت اور متحرک عناصر کی پُر جوش ترجمانی بھی ہو۔ بقول میتھیو آرنلڈ ''شاعری زندگی کی تفسیر ہے''۔ وہیں شیلے نے شاعری کو ''تہذیبِ آئین اور مختلف

علوم کا سرچشمہ'' قرار دیا ہے۔ کیٹس کو شاعری ''انتہائی درجے کی حیرت سے ہم آغوش'' کرتی ہے جب کہ سرفلپ سڈنی تو شاعری کو ''جملہ علوم وفنون کی دایہ'' کا نام دیتے ہیں۔ دیکھا جائے تو مطلب یہی نکالا جاسکتا ہے کہ دراصل انسان کی بنیادی وفطری لطف اندوز ہونے والی جس شاعری کے ذریعہ ہی عیاں ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ داخلی و خارجی محسوسات سے لبریز ہوکر قلب ونظر کو وسعت بخشتی ہے۔ اس کا کینوس نہایت وسیع ہے۔ جیسا کہ شمیم حنفی فرماتے ہیں:

''ہر فن کی طرح ادب بھی اپنی تخلیق کے لیے کسی پروگرام یا نصب العین یا عقیدے کا محتاج نہیں ہوتا، البتہ ادبی اظہار کی سطح تک پہنچنے کے لیے ہر مقصد، شاعر کی فنی استعداد کا محتاج ہوتا ہے۔ انسانی تاریخ میں ادب کو کبھی اس لیے وقیع نہیں سمجھا گیا کہ اس سے سیاسی وسماجی یا تہذیبی معلومات حاصل کی جائیں۔ کیوں کہ ادب تاریخ کا حاشیہ نہیں، اس کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ یہ اپنے عہد کے حقائق اور انسانی وجود کے طلسم وتماشہ کو زمان ومکان کی بساط سے اٹھا کر ایک پائیدار اور ہمہ جہت حقیقت سے ہم کنار کرتا ہے۔ اسے ایک تخلیقی تجربہ بناتا ہے۔ لمحاتی صداقتوں کو پیکر عطا کرتا ہے۔ ایک ایسی انوکھی اور دلنواز آگہی کا وسیلہ بن جاتا ہے جو مجرد فکر کی گرفت میں نہیں آتی۔ ادب ذاتی واقعات کو بھی ایک کائناتی رمز کی صورت دیتا ہے اور مخصوص ثقافتی اور عصری پس منظر کو ایک دائمی تناظر کی حیثیت دیتا ہے''۔ ۵۰؎

اور چوں کہ تاریخ تہذیب کا عنصر ہے جس میں ماضی کا عکس نظر آتا ہے۔ جن سے ہمارا ادب ذرخیز ہوا، جن سے ہماری شاعری نے اشارے، کنایے، تلمیحات، تشبیہات واستعارات کا کام لیا۔ ہمارے ماضی میں اعمال اوران کے نتیجے، ہمارا مذہبی طریقۂ کار، فرقہ واریت، تمدنی ارتقاسب کا عکس سب میں نمایاں ہے۔ یہ عکس ہماری تاریخ، ہمارے رویے، ہماری کامرانی و نامرادی سب پر منحصر ہے۔ جب ہم ہندوستان کے پس منظر میں ہندوستانی ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک مشترکہ تہذیب نمایاں ہوتی ہے۔ وہ تہذیب جو ہندوستانی جسم میں اس روح کی مانند ہے جس کے بنا اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس

مشترکہ کلچر کی بنیاد اسلام کے آنے کے بعد مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔

دیکھا جائے تو اسلام کی حقیقی روح اور مشترکہ اسلامی جسم میں بہت فرق ہے۔ ہندوستانی مسلم معاشرہ آج تک ان دونوں کی کشمکش کا سامنا کر رہا ہے۔ مگر موجودہ تہذیب جسے مسلم حکمراں نے رائج کیا بہت طاقت ور ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر میں اتنی بدعات شامل ہوگئی ہیں کہ آج انھیں ہم اسلامی تہذیب کا ہی ایک حصہ مانتے ہیں۔ اتنی رسومات، اعتقادات ہیں کہ اب ان کے پس منظر میں جا کر ان کا اصل منبع تلاش کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ بقول عبدالماجد دریابادی[۴۹] ''اسلامی تمدن کی بنیادیں خدا پرستی و خدا ترسی، دیانت داری، امانت و عفت و صداقت، تقویٰ و طہارت اور آخر میں اس کی تاریخی عظمت وصولت ہیں''۔

اسلام ایک عظیم تہذیب کا علمبردار ہے جس نے ماضی، حال مستقبل کے علاوہ حیاتِ آخر کا بھی احاطہ کر رکھا ہے۔ اس تہذیب کے اقدار اتنے بلند اور قابلِ عمل ہیں کہ جنھیں حیاتِ انسانی اور قوتِ انسانی کے مطابق بنایا گیا ہے۔ زندگی کا ضابطۂ حیات ہے جہاں سے روگردانی زوال، جہالت اور پستی کی طرف لے جاتی ہے۔ جب ہم آج کی اسلامی تہذیب کی بات کرتے ہیں تو وہ خالص اسلامی نہیں ہوتا بلکہ ہزار ہا بدعات کے ساتھ خلط ملط کر کے جو شکل بن گئی ہے اس سے مراد لی جاتی ہے۔ تعزیہ، علَم، شب برأت، آتش بازی، کونڈے، نیاز، حلوہ، ملیدہ، قوالی، سوانگ، ڈھولک، تاشے، عرس وغیرہ اسلام کے جزو نہیں، یہ اسلامی تہذیب نہیں اور نہ ہی خوش لباس، سائنسی ایجادات و آسمان کی وسعتوں پر پہنچنے کی کوشش سے انکار اسلامی تمدن ہے۔ خدا خود قرآن میں دعوت دیتا ہے کہ قوت حاصل کرلو تو چاند تک پہنچ سکتے ہو۔ یہ قوت جسمانی نہیں بلکہ اشرف المخلوق کی ذہنی قوت اور اس کے ذریعہ ترقیاں ہیں۔ اعمال و معاملات میں کبر و نخوت اگر عجمی تہذیب کا نمایاں عنصر ہیں تو مسیحی تہذیب و تمدن پر شرک کی پرت جمی ہوئی ہے۔ صنم پرستی، چڑھاوے، نیاز کے ساتھ شادی بیاہ، پیدائش و موت سے متعلق رسمیں ہندوستانی بلکہ ہندوانہ ہیں، جنھیں ہم نے اپنالیا ہے۔

دراصل اسلامی تہذیب پوری طرح اجتماعیت اور اخوت پر مشتمل ہے۔ یہ اجتماعیت پیدائشِ انسان سے موت تک، اعمال سے کردار تک کاروبارِ دنیا سے لے کر کاروبارِ دین تک سب پر حاوی و جاری ہے۔ اسلام بذاتِ خود ایک مکمل تہذیبی نظام ہے۔ مگر جب اس کی آمد ہندوستان میں ہوئی تو یہ براہِ ایران آئی جس کے سبب اس پر فارسی تہذیب کا رنگ و روغن چڑھ چکا تھا۔ بظاہر بھی ایران کے اور

ہندوستان کے جغرافیہ میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ ایران کے شمالی کوہستانی علاقے میں شدید ٹھنڈک، وسطیٰ علاقہ کی آب و ہوا معتدل جہاں کی زمین زرخیز اور قابلِ زراعت ہے، جنوبی علاقہ گرم، ریتیلا اور بنجر۔ مشرف عالم کے مطابق:

"آریائی قوم کی پاکی و سادگی میں بابلی و آشوری قوموں سیر تر تھی لیکن میدانِ تمدن میں ان قوموں کو آریاؤں پر فوقیت حاصل کی۔ علاوہ ازیں دنیا کی قدیم اقوام کی طرح آریاؤں کے قدیم مذہب کی بنیاد عناصر، اجسام سماوی اور فطری طاقتوں کی پرستش پر تھی۔ اسے ظاہر پرستی کہا جاسکتا ہے"۔ ۵۲

اہلِ فارس یا زرتشتیوں کے یہاں "زنار" جسے "کستی" کہا جاتا ہے پہنتے ہیں یہ مذہب کارآمد جانوروں کی قربانی کے لیے منع کرتا ہے، سماج میں شراب پینا محبوب مشغلہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی ادب میں زنار اور شراب و جام کا کثرت سے استعمال ہوا ہے، جس کے سبب اردو اور ہندوستان میں بھی رائج ہوا۔

فارسی زبان و ادب کی اپنی تہذیب رہی ہے خاص طور سے اس کا روحانی مزاج، خدا کو واحدِ مطلق خیال کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے مگر صوفی یا تصوف کے مطابق ہر ذرّے میں اس کا پرتو تلاش کرنا، ہر ایک جز میں کل کی تلاش یا کل کو دنیا کی مختلف چیزوں میں بکھرا ہوا پانا الگ نظریہ تھا۔ انھوں نے حسن و عشق کو نئے معنی و اصطلاحات میں استعمال کیا۔ خدا کی محبت جو بندے کے دل میں ہونی چاہیے اسے عشقِ حقیقی کا نام دیا۔ ایسا عشق جس میں خود فراموشی دنیا اور اس کے لوازمات سے دوری، روحانیت کے زمرے میں آئے۔ حقیقت تک پہنچنے کے لیے مجاز کی مدد لی گئی اور اس کے لیے مختلف مراحل طے کیے گئے۔

تصوف میں کسی بھی قسم کا تعصب، نسل پرستی، قوم پرستی، وطنی اور مذہبی تنگ نظری کا گزر نہیں ہوتا۔ بلکہ وسعتِ ذہن، کشادہ دلی، انسان دوستی، عالمی اخوت و محبت اس کے اہم عناصر میں سے ہیں۔ یہ جذبہ فارسی شاعری میں نمایاں ہوا پھر اس کے ذریعہ ہندوستانی ادب کا بھی حصہ بن گیا۔

فارسی شاعری نے شاعری کو ایک غمگین ماحول دیا۔ وہ دنیا کو ناپائیدار اور عارضی خیال کر کے یاس، ناامیدی و قنوط کی کیفیت طاری رکھتی ہے۔ ان کے نزدیک اس دنیا کے تمام کاروبار محض دکھاوا اور

ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اردو ادب خصوصاً کلاسیکی ادب میں اس کا قدم قدم پر جلوہ نظر آتا ہے:

''ایران کی قدیم تاریخ کا مطالعہ فارسی و اردو ادب کے سلسلے میں اس لحاظ سے ناگزیر ہے کہ اُس ملک کی تاریخ و تہذیب نے ان دونوں ادب کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے۔ اساطیری و تاریخی ادوار کے بادشاہ، پہلوان، مذہبی رہنما، مذہبی تہوار اور دوسرے رسم و رواج ادبیات کے اہم موضوع ہیں، چنانچہ کبھی کبھی استعارے کی شکل میں کبھی تلمیح و اشارے کے طور پر اور کبھی حقیقی انداز میں شاعروں اور ادیبوں کے کارناموں میں ان کو موٴقر جگہ ملتی ہے۔ تہمورس، ہوشنگ، فرکیانی، افراسیاب، کیخسرو، کیکاؤس، زال، رستم، سہراب، اسفندریار، زرتشت، زند و پازند، نوشیرواں، خسرو پرویز، شیریں و فرہاد، مانی، مزدک، باربد، ایسے نام ہیں جن سے فارسی ادب کا کیا ذکر اردو ادب کا ہر طالب علم واقف ہے۔ صرف یہی نہیں ہماری تہذیبی زندگی میں بھی قدیم ایرانی تہذیب کے تاثرات کے نشان واضح طور پر قدم قدم پر ملتے ہیں''۔ ۵۳

اردو زبان و ادب پر ہی نہیں بلکہ ہندوستانی تہذیب پر بھی فارسی تہذیب اثر انداز ہوئی۔ نذیر احمد یہ اثرات کئی محرکات کے سبب بتاتے ہیں۔ اول یہ کہ اردو ادب فارسی کا چربہ ہے۔ دوم یہ کہ اردو ادب کا ہر بڑا شاعر و ادیب اصلاً فارسی کا شاعر تھا۔ سوئم شاہنامے اور دوسری رزمیہ داستانوں کے ترجموں نے ایرانی اثرات اردو میں عام کیے۔ چہارم قدیم ایران کی اساطیری طویل داستانوں کا ترجمہ جن کی بنیاد قدیم ایرانی قصوں و بادشاہوں اور واقعات وایقان پر مشتمل ہے۔ جیسے طلسم ہوشربا، قصہ امیر حمزہ وغیرہ۔ پنجم ایرانی عشقیہ داستانوں کا زبان زد ہونا اور دیگر تمام ڈرامائی داستانیں، منظوم و منثور جنھیں عوام میں مقبولیت رہی۔ ۵۴

لیکن حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ اردو شعر و ادب کا تعلق جتنا فارسی تہذیب سے اس سے کہیں زیادہ ہندوستان (ہندو) تہذیب سے بھی ہے۔ اصناف کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں صاف طور پر افکار و خیالات اور فلسفۂ زندگی کے اثرات نظر آتے ہیں جو یہاں ہمیشہ سے رائج تھے، جنھیں مختلف

تمدنی پیش رفت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

غزل کے مفہوم چاہے عورتوں سے یا عورتوں کی گفتگو کیوں نہ ہوں مگر یہ ایک بڑی حقیقت ہے کہ غزل نے تمام ہندوستانی اقدار کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کی ہے۔ غزل جیسا کہ معلوم ہے کہ عربی کے قصیدہ کی تشبیب کا ہی دوسرا نام ہے، جس میں مختلف موضوعات کو نظم کیا جاتا تھا بعد میں فارسی میں یہ ایک الگ مستقل صنف کی حیثیت کی حامل ہوگئی۔ اور فارسی سے اردو میں رائج ہوئی۔ اور اس طرح مقبول ہوئی کہ اس کے مقابلے میں کوئی اور شعری صنف نہ ٹھہر سکی۔ اول تا موجودہ دور تک اس کی عوامی مقبولیت میں کمی نہیں آئی ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ اس نے عوام سے، ان کے جذبات سے خود کو بہت قریب رکھا ہے، ان کے مسائل اور محسوسات کو پُر اثر انداز میں پیش کیا ہے۔ جب کسی فن میں کسی قوم کے دائمی اقدار نمایاں ہوتے ہیں تو وہ فن اُس قوم کی تہذیب کا عکس بن جاتا ہے۔ یہی بات اردو غزل میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ اس میں بھی بنیادی مشترکہ اقدار باوجود انقلابِ زمانہ ہمیشہ قائم رہے اور غزل اپنی اُن روایات کی پاسداری پوری ایمانداری سے کرتی رہی جس میں اس نے پرورش پائی۔

غزل کی اساس ہمارے تہذیبی اقدار پر مبنی ہے۔ وہ اقدار جو کئی برسوں کی ہماری کشاکش، کامیابی، کامرانی و ناکامی کی صورت میں تشکیل پائے، جنھیں تاریخ نے روشن کیا، اخلاق و روایات نے سجایا اور معاشرے نے جنھیں قابلِ احترام جان کر سر آنکھوں پر رکھا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی فرماتے ہیں:

> ''اردو، میں اس غزل کی کوئی دو ڈھائی سو سال کی روایت موجود ہے، ان دو ڈھائی سو سالوں میں ہماری زندگی کا قافلہ جن راہوں سے بھی گزرا ہے، ہماری تہذیب جن منزلوں سے بھی روشناس ہوئی ہے اس کی سچی اور صحیح تصویر ہماری غزل میں ملتی ہے۔ اس عرصے میں ہم نے جو کچھ بھی محسوس کیا ہے، جو کچھ بھی سوچا ہے، جو تصورات بھی قائم کیے ہیں، جن نظریات کی بھی تشکیل کی ہے ان سب کی صحیح آئینہ داری جیسی غزل نے کی ہے شاید ہی کسی اور صنفِ ادب نے کی ہو''۔[۵]

بہر حال غزل حسن و عشق کی واردات کے بیان کا ہی نام نہیں ہے، غزل وہ ہے جس نے انسان کے خوبصورت فطری جذبات کے ساتھ ہی زندگی کے دیگر پہلوؤں پر بھی حقیقت پسندانہ نگاہ ڈالی ہے۔ غزل کا موضوع بہت وسیع ہے، حالاں کہ کلاسیکی غزل میں دوسرے موضوعات پر کم ہی توجہ دی گئی ہے

اور غزل کو اس کے لغوی معنی کے طور پر ہی اپنایا گیا مگر باوجود اس کے بھی شعرا کے یہاں ایسے اشعار دانستہ وغیر دانستہ تحریر میں لائے گئے، جن میں عصری عہد کی کسی نہ کسی تہذیبی قدر کی طرف اشارہ ملتا ہے:

> ''کلاسیکل غزل کی اساس چند ذاتی اور معاشرتی قدریں تھیں۔ نئی غزل قدروں کے زوال کی نوحہ گر اور صداقتِ خیال کی پیرو ہے، جس کے آئینے میں اسے خوابوں کے آراستہ نگار خانوں کے بجائے کھردری حقیقتوں کے پیکر دکھائی دیتے ہیں''۔ [۵۹]

چوں کہ اس صورت میں غزل ہماری روایات کی امین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رشید احمد صدیقی نے اسے ''اردو شاعری کی آبرو'' اور تہذیب کا دوسرا پہلو قرار دیا ہے:

> ''غزل کو میں اردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں، ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے۔ دونوں کی سمت ورفتار، رنگ و آہنگ، وزن ووقار ایک دوسرے سے ملا ہے''۔ [۶۰]

پھر آگے وضاحت کرتے ہیں:

> ''ہندوستان میں جن زبانوں، بولیوں یا روایات کی بڑی مان دان ہے یا رہی ہے۔ اردو ان کی غزل ہے اور اردو کی 'بیت الغزل' غزل۔ غزل فن ہی نہیں فسوں بھی ہے، شاعری ہی نہیں، تہذیب بھی ہے۔ وہ تہذیب جو دوسری تہذیبوں کی نفی نہیں کرتی بلکہ ان کی تصدیق کرتی ہے۔ کبھی تنقید وتزکیہ بھی''۔ [۶۱]

اسی لیے غزل کا ماحول آج روایتی نہیں رہا۔ اسی لیے لفظ کے حسین جال انسان کی فکر وخواہش پر پردہ نہیں ڈال سکتے۔ ہر ذی حس جو جیسا ہے اسے اسی طرح دیکھنا، سننا یا بیان کرنا چاہتا ہے۔ کسی غلط فہمی یا خوش فہمی کے لیے اس کے پاس کوئی جواز نہیں۔ اس نے خوابوں کو بکھرتے، ٹوٹتے، منتشر ہوتے اور لٹتے ہوئے دیکھا ہے، حقیقت سے واقفیت اس کے لیے اذیت ناک رہی ہے۔ قدیم سے وسط اور وسط سے جدید دور تک غزل نے بھی ایک طویل سفر طے کیا ہے، جہاں اس کی راہ میں گل آئے تو کبھی خار، عیش و عشرت کا ماحول دیکھا تو کبھی بھوک وافلاس میں سسکتی زندگیاں، اپنوں کو پرایا اور پرایوں کو اپنا ہوتے

ہوئے دیکھا۔ حیوانوں سے بدتر زندگیاں دیکھیں، آسمان کی اونچائیوں کو چھوتے ہوئے انسانی ارتقاء کا بھی نظارہ کیا۔

شاعر بھی ایک انسان ہوتا ہے کسی عام آدمی سے زیادہ حساس اور مفکر، اس کی نگاہ زیادہ گہری، دل حد درجہ گداز۔ وہ اپنے احساسات و خیالات کو لفظوں کے ایک سانچے میں ڈھالتا ہے کہ قاری و سامع کے جذبات اس کے جذبات کے ساتھ مل کر دل و دماغ میں طلاطم پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غزل محبوب صنفِ سخن ہے۔ اتنی عزیز کہ غزل پر سخت تنقیدیں آنے کے باوجود اس کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اردو دنیا کا یہ قیمتی سرمایہ ہے۔ لوگ اس کے معترف اور گرویدہ ہیں۔ اسی لیے رشید احمد صدیقی اگر اسے 'اردو شاعری کی آبرو' کہتے ہوئے نظر آتے ہیں تو فراؔق اسے ''عطر'' کہتے ہیں، جس کی خوشبو ادبی و دائمی ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین نے ''موسیقی'' کا نام دیا کہ اس کی لے و بحر ہر ایک پر وجد طاری کر دیتی ہے۔ اسی طرح نیاز فتح پوری نے اسے ''روح'' کہہ کر اس کے لازوال ہونے کا اعتراف کیا، تو اختر اورینوی نے ''تصویروں کا نگار خانہ'' کہہ کر اس کی رنگارنگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ رنگارنگی، غزل میں زندگی سے عبارت ہے۔ غزل کا وجود نئے رشتوں، نئے حالات و اثرات کے سبب ہوا۔ وہ باتیں جو نظم کی دیگر اصناف بیان کرنے سے قاصر تھیں انھیں لطیف اشاروں، کنایوں میں پیش کیا جانے لگا۔ کبھی کبھی سیاسی و سماجی حالات بات کھل کر کہنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اسی طرح جدید دور میں بھی انسان کا ذہن اتنا ارتقا پا چکا ہے کہ وہ طوالت سے اکتا جاتا ہے، چند جملے یا اشارے اسے گہرائی تک پہنچا دیتے ہیں، ہر شخص کے اپنے جذبات و احساسات اس کے حالات کے زیر اثر پرورش پاتے ہیں اور وہ انھیں کی بنیاد پر سوچتا اور سمجھتا ہے۔ اس کی انھی فکر و عمل کا اظہار غزل میں ہوتا ہے۔ بقول یوسف حسین خاں:

> ''غزل گو شاعر کے کلام میں ہمیں ایک قسم کی مخصوص فضا ملتی ہے جو اس شاعر کی داخلی کیفیات اور ان تمدنی احوال کا نتیجہ ہوتی ہے جن میں اس نے نشو و نما پائی ہے''۔ [۶۲]

اس بحث کے نتیجہ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ غزل تہذیبی انعکاس کا دوسرا نام ہے۔ تہذیب مختلف النوع کیفیات سے دوچار رہتی ہے، اسی مناسبت سے غزل میں سید احتشام حسین کے مطابق زندگی کے اکثر و بیشتر پہلو اچھی یا بری شکل میں جگہ پا چکے ہیں۔ یعنی ان میں فلسفیانہ، اخلاقی، سیاسی، سماجی، صوفیانہ اور

منظری موضوعات مختلف ادوار میں جگہ پاتے رہے ہیں۔[۳] اسی وجہ سے غزل کو ہماری تہذیب کا اہم حصہ قرار دیا جاسکتا ہے کہ اس نے کبھی اپنے اقدار سے دامن نہیں چھڑایا۔ معاشرہ نے جن اقدار کو زندگی سمجھا، غزل نے بھی روح ڈال دی۔ چاہے جو رجحان رہا، غزل نے پوری ایمانداری کے ساتھ اس کو نبھایا۔ حقیقت یہ ہے کہ غزل طبیعت شناس رہی ہے کہ مزاج ونفسیات کو سمجھا اور خود کو اس کے مطابق ڈھال لیا۔

سچ تو یہ ہے کہ غزل کی عظمت اس کی سچائی، خلوص اور اس کے موضوعات میں مضمر ہے۔ اس میں پاکیزہ جذبات سے لے کر نفسانی خواہشات تک کا ذکر ہوتا ہے۔ یہ جہاں عرفان حاصل کرتی ہے وہیں زندگی کی اُن بصیرتوں سے بھی واقف رہتی ہے جو قلب ونظر کو منور کرنے کے لیے کافی ہے۔

غزل مشترکہ وانفرادی اُن تمام قدروں کی ترجمان ہے جو انسان کے لیے بھی اعلیٰ و بلیغ ہیں۔ جو افادیت کے حامل ہیں۔ ان خصوصیات کی آماجگاہ بھی ہے کیوں کہ یہ ہماری مشترکہ تہذیب کے تمام اعلیٰ تمثیلی مدوجزر کا احاطہ کرلیتی ہے۔

اردو غزل کا آغاز امیر خسرو سے کہا جاتا ہے۔ اگر ان کی اردو شعری تخلیق جو ایک مصرع فارسی اور ایک مصرع ہندی پر مشتمل ہے، ان کی غزل تسلیم کرلی جائے تو یہ اردو غزل کا اوّلین نقش کہلاتی ہے۔ حالاں کہ اب ثابت ہو چکا ہے کہ یہ غزل امیر خسرو کی نہیں ہے، مگر اس کی قدامت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ غزل ان لطیف جذبات کی عکاسی کرتی ہے جس میں چاہنے والے کی دل کی دھڑکنوں، اس کی بے قراریوں کے ساتھ کسی کے التفات کے منتظر احساسات غالب ہیں، جس کا مطلع ہے:

ز حالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شمالی ہند کی اِکاّ دُکاّ مثالوں کے برخلاف جنوبی ہند میں اردو زبان وادب کے ابتدائی نمونے زیادہ قابلِ اعتراف ہیں۔ جنوبی ہند یا ہم جسے دکن بھی کہتے ہیں اس کی جغرافیائی خصوصیات نے اسے ایک الگ منفرد تہذیب عطا کی۔ یہ تہذیب تمام علاقائی خصوصیات کی حامل رہی ہے۔ ہر تہذیب کو پروان چڑھانے اور خدوخال بنانے میں کچھ عناصر معاون ہوتے ہیں:

''ملک کا محلِ وقوع، زمین کے نشیب وفراز اور گرم سرد ہوائیں قوموں

کی ذہنیت اوران کے طریقۂ بود وباش کو متعین کرتی ہیں۔ دوسرا اہم
محرک وہ تصورِ حیات اور فلسفۂ زندگی ہے جو ملک کے دانشور، مفکر اور
سماجی وسیاسی رہنما پیش کرتے ہیں اور قوموں کے مزاج کو ایک خاص
سانچے میں ڈھال دیتے ہیں"۔ [۶۳]

مخلوط کلچر جو بہمنی سلطنت میں پروان چڑھ رہا تھا۔ باہمی اتحاد و یگانگت و رواداری کا علمبردار تھا۔ یہاں ہندو مسلم تہذیب باہم شیر وشکر ہوتے ہوئے دیکھے جاسکتے ہیں، جس کی نمائندگی اس دور کی غزلیں بھی کرتی ہیں۔ بہمنی عہد کے مشہور شاعر لطفی [۶۴] اور مشتاق [۶۵] (عہد سلطان محمد شاہ بہمن متوفی ۱۵۱۸ء) کی غزلیں دکن کی غزلوں کا ابتدائی نمونہ کہی جاسکتی ہیں۔ جن میں ہند کی روایت اور فارسی کا مزاج نمایاں دیکھا جاسکتا ہے:

آبِ حیات اور لب ترے جاں بخش و جاں پرورا ہے
مشتاقؔ بو سے سوں پیا امرت بھری اور کل گھڑی

(مشتاقؔ)

لطفی ترے چلن کی پاکی کہاں ہے اس میں
جیوں پانچ پانڈوؤں کے کہنے مو دھر پتی ہوں

(لطفی)

سجن کے وصل کا اشتیاق، ہندوستانی پھول چنپا اوراس کی مہک، ایک پیڑ پر کھڑے ہوکر سادھوسنیاسیوں یا تپسّیوں کی طرح تپسّیا کرنا، مندر میں بھوگ لگانا، بھگوان کے آگے، مندر کے دیے کی طرح ساری رات جلنا اور پانچ پانڈوؤں اوران کی مشترکہ پتنی دھروپتی (دروپدی) کی طرف اشارہ ہندو تلمیح ہے۔ صاف صاف طور سے ہندوستانی ماحول، مزاج اورعقاید کی تصویریں ہیں۔

علاوہ ازیں بہمنی عہد میں متصوفانہ خیالات خوب پرورش پارہے تھے۔ مختلف صوفیائے کرام کے ارشادات، لوگوں کے دل ودماغ پر اثر انداز ہورہے تھے، جس میں بھائی چارگی، مذہبی رواداری، محبت واخوت، عشقِ خدا اور عشقِ بندہ دونوں شامل تھے۔ خوش نامہ، خوش نغز، شہادت الحقیقت جیسے پائے کے نثری نمونوں کے ساتھ شہباز حسینی [۱۸] جیسے صوفی غزل کہہ رہے تھے جہاں ان کی غزلوں میں ان کی فکر نمایاں نظر آتی ہے، جن سے ہر خاص وعام متاثر ہوتا جارہا تھا اور خدا و بندے کے درمیان حائل ساری

دیواریں آہستہ آہستہ ٹوٹتی جارہی تھیں۔نمونہ دیکھیں جس میں تمثیلی انداز اختیار کیا گیا ہے:

تو تو صحی ہے بشکری کر نفس گھوڑا سارتوں
ہوئے نرم نہ تجھ اور چڑے پس کھائے گا آزارتوں

جب کہ عادل شاہی دور میں غزل کو اس کے لغوی معنی یعنی عورتوں سے گفتگو کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا۔عورت اگر محبوب ہے تو اس کی ہر ادا، اس کے جسم کے خدوخال، عاشقانہ معاملہ بندی اور اس سے بوس و کنار کا ذکر ہے۔اور جہاں عورت عاشق ہے تو تمام جذبات عورت کی زبان اور عورت کی طرف سے بیان کیے گئے ہیں۔علاوہ ازیں درجِ ذیل اشعار میں ہندی الفاظ و روایات کے ساتھ ہی تہذیب کے مختلف عناصر بھی دکھائی دیتے ہیں:

لذت لذیذ نرل صورت جمال حلوا
گوری کا رنگ لب ہے جیو کا لال حلوا

(مرزا دولت)

جوبن ستین سج کر گج مست ہو چلی ہے
مگر سو پچناں ہور گھونگراں کی کھلبلی ہے

(ظہورؔی)

نصرتؔی، شوقؔی، شاہؔی، عادل شاہی دور کے اہم شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ان کی شاعری میں لذتِ جسم اور عشق کے جنسی جذبات کا کھل کر اظہار کیا گیا ہے۔دیگر شعراء کے یہاں بھی جنسی پہلو بہت زیادہ ہے۔شاید تہذیب میں اس وقت ہر طرف عورت ہی چھائی ہوئی تھی۔کبھی مردانہ، کبھی زنانہ زبان میں ایک ہی جذبے کی مختلف آوازوں میں بازگشت ہو رہی تھی:

تج نین کی نرمی کنے منگتے ہیں موتی آبرو
یا روپ کی تو کان ہے یا حسن کا سمندر ہے

(شاہؔی)

چندر بدن کہیا تو کہی موں سنبھال بول
سورج مکھی کہیا تو کہی یوں نہ گھال بول

(نصرتؔی)

دلبر سلونی نین پر کھینچی ہے سوکا خوبتر
خطاط جیوں مار دیا رقم چھندوں تلکت کے صاد پر

(شوقیؔ)

شاہ حسین حسینی [۶۷] شاہ عبدالقادر قادر [۶۸] خواجہ محمد دیدار فانی نے بھی اردو غزل گوئی میں داد حاصل کی ہے۔ عادل شاہی دور میں ان شعرا کو بہت تقویت ملی۔ ان شعرا نے عصری تہذیب، سوچ وفکر کو شعری سانچے میں ڈھالا۔ عیش ونشاط کے خوبصورت لمحات کے تصور کے ساتھ، تصوفانہ خیالات کا بھی عکس ان کے یہاں آسانی سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔ اس کی وجہ تھی کہ وہ دور جہاں لذت پرستی کو عار نہیں سمجھا جاتا تھا وہیں وہ قربتِ الٰہی اور احساس کربِ آدم سے بھی بے نیاز نہیں رہنا چاہتے تھے:

ہوا تھا شوق مجکوں طبع تیری آزمانے کا
نہیں ثانی ترا جگ میں توں نادر ہے زمانے کا

(حسینیؔ)

عادل شاہی دور کے سب سے اہم صاحبِ دیوان شاعر ہاشمی بیجاپوری ہیں۔ جنھیں بڑا قادرالکلام شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہاشمیؔ کی غزلوں میں عہدِ عادل شاہی کی پوری تہذیب نگاہوں کے سامنے آکر کھڑی ہوجاتی ہے۔ حالاں کہ غزلوں کا انداز ریختی لیے ہوئے ہیں۔ مگر اسے مکمل ریختی سمجھنا ناانصافی ہوگی۔ چوں کہ ہاشمی کی شاہی محل سرا تک پہنچ تھی۔ وہاں کی چھیڑ چھاڑ، لباس، آرائش، زبان و محاورات ان کی غزلوں میں رچ بس گئے ہیں:

"ہاشمی کی ریختی دکن کی نسوانی زندگی کا ایسا مرقع ہے جس میں دکن کی عورتوں کی زبان، ان کی پوری تہذیب، طرزِ فکر، جنسی زندگی کی نفسیات، اس عہد کی سیاسی و معاشی حالات کا اثر خانگی زندگی پر جیسی تمام تفصیلات محفوظ ہوگئی ہیں... ہاشمی کا دیوان دکن کی مستورات کی زبان، محاوروں اور کہاوتوں کا گنجینہ ہے۔ یہ دکن کی عورتوں کی قدیم زبان ہی نہیں بلکہ آج بھی دکن کی دیہاتی عورتوں کی کم وبیش وہی زبان ہے جو ہاشمی نے استعمال کی ہے"۔ [۶۹]

ہاشمی کی غزلوں میں روزمرہ زندگی کا کون سا پہلو ہوگا جسے نظرانداز کیا گیا ہو۔ کنگھی، چوٹی،

کاجل، مسّی، بنگڑی، خوشبو، لال گوٹہ، صندل، اگر، موئے بند، عنبر، بدھی، سنپولا و دودھاری (چوڑی کی اقسام) آرائش کے لیے۔ شیر، نان، قلیہ، کوڑ دھانی، بتاشے، ناریل کی روٹی، سیخ کے کباب، شولہ، جلیبی، چونگے، برنج، شکر پارے پکوان کے لیے۔ جنتر، منڈل، دھرپد، چھند، تنبورا، سارنگی، خیال، کڑکے، گیت، دف، رُباب، جھلاجھل، ڈھولک ساز و آواز کے لیے، اور لباس میں زرینہ، زری، پشواز، چولی، گھونگھٹ، شال، پٹکا، گجرے، دوسڑی، گلسر، بدھی، گھنگھرو، منگڑی، سیس پھول وغیرہ کا اپنی غزلوں میں استعمال بے تکلفی سے کیا ہے:

کنگھی چوٹی سو کاجل کر دھنا نیٹ پاٹ ٹھمکے سوں
سنگاتی باج اجڑیا خوں مسوا اینٹ پاٹ ہو ٹھم کا

(ہاشمی)

تھی بھوک لئی کھانا و لے نگلوں تو نگلا نا گیا
دیکھی تو قلفی شیر برنج روٹی گرم منواس تھا

(ہاشمی)

ساتی سنگاتی نیں کر غزلاں قصیدے مثنویاں
کڑکے کبت برbال چھند سنائی اشلوک کا

(ہاشمی)

ہری چولی کی کیا تعریف کروں اودے ڈنڈا رس کا
تو گوری خوب لگتا ہے تہبد نولال اطلس کا

(ہاشمی)

اس طرح خود گولکنڈہ کی قطب شاہی حکومت کا تہذیبی و تمدنی اعتبار سے نہایت زرخیز دور رہا ہے۔ شاہانِ گولکنڈہ نے شعر و ادب کی نہ صرف سرپرستی کی بلکہ خود بھی صاحبِ دیوان شاعر ہوئے۔ اس عہد میں اسلامی تہذیب کے ساتھ ہندو تہذیب کا اس طرح اختلاط ہوا کہ صحیح معنوں میں گنگا جمنی تہذیب بن گئی۔ لباس، خوراک، زیورات، روزمرہ کے تمام کاموں میں مقامیت جھلکتی ہے۔ مساجد، مقابر، محل، آشورہ خانے مشترکہ تہذیب کی نشاندہی کرتے ہیں۔

قلی قطب شاہ کی شاعری مشترکہ تہذیب کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔ تہذیب کے ہر پہلو کو قلی

قطب شاہ نے شعر کا جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔جس میں اس کی متنوع خصوصیات کی حامل شخصیت کا دخل بھی تھا۔اس کی سیرت خوبصورت اوراس کا ظاہراور باطن ایک تھا۔امن پسندی، صلح جوئی، رحم دلی ودریادلی اس کے خمیر میں رچی ہوئی تھی۔دوسری جانب دکنی تہذیب میں صنفِ نازک کا حصول اوران سے اپنے جذبات کی تسکین حاصل کرنا عام بات تھی، جس کی رہنمائی قلی قطب شاہ خاص طور سے کررہا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام کو اردو ادب میں جنسی شاعری کا پہلا بھرپور نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے:

''راگ رنگ اور عیش ونشاط کے جس رنگین ماحول میں محمد قلی قطب کی شخصیت کی نشوونما ہوئی تھی اس کی کچھ اپنی سماجی اور اخلاقی قدریں تھیں۔قطب شاہی سماج میں ہر طرف حسن ونغمہ امرت اںثار رہے تھے، شراب وشباب اور عشق ومستی کی حکمرانی تھی، محلات کی معاشرت میں منفی میلان کے اظہار کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔شخصی حکومت میں بادشاہ کی ذات اخلاقی پابندیوں اور احتساب سے بلند ہوتی ہے۔اس لیے محمد قلی قطب اپنی عاشقانہ شاعری میں خاصا بے باک اور بدمست نظر آتا ہے، حائلات موالقات جوش و ہیجان کو کچل دیتے ہیں۔محمد قلی کی نفسیات ایسی کسی مجبوری کی شکار نہیں تھی۔وہ اپنی زندگی اوراپنے کلام میں بے مہار جنسی جذبے کا ترجمان نظر آتا ہے''۔ ٭ ۷

یہ جنسی جذبہ قلی قطب شاہ کے یہاں 'بھوگ بلاس'، 'کام سوتر' اور 'کوک شاستر' وغیرہ جیسی جنسیات پر مبنی خالص ہندوستانی کتابوں کی رہینِ منت ہے۔آزاد ماحول، ہر چیز پر دسترس، امن وسکون نے قلی قطب شاہ کو حسن پرست بنادیا تھا۔یہ حسن پرستی تعیش اور حد درجہ بڑھی ہوئی جنسیت تک پہنچ گئی تھی، جسے اس نے مذہب کا رنگ دینے کی کوشش کی اور اپنی تمام خواہشات کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اسے 'نبی کا صدقہ' قرار دیا۔

محمد قلی کی غزل اوراس کا ماحول ہندوستانی دیومالائی ہی نہیں بلکہ طرز وفکر سے بھی ہندوستانی ہے۔اسکا محبوب، ناز وادا، خدوخال، لباس وزیور، نشست وبرخاست، رنگ روپ تمام لوازم مقامیت لیے ہوئے۔اس کی وجہ ہے کہ محمد قلی کی پرورش جس تہذیب کے زیراثر ہوئی وہ جغرافیائی نقطۂ نظر سے ایک

اکائی اور تہذیبی نظریے سے ہندوستانی تھی۔ اس نے تہوار، رسومات، عقائد، لباس، طرزِ معاشرت، طرزِ تمدن اور فکر و عمل سے اسی مقامی اقدار کو اپنایا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں دکن کے موسم، پہاڑ، دریا کے ساتھ ان تمام مقامی رویوں کو بھی دیکھا جا سکتا ہے جو عوام و خواص میں اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔ مصنف ''دبستانِ گولکنڈہ'' تحریر فرماتے ہیں:

> ''محمد قلی کی غزلوں کا مطالعہ کیجیے تو ان میں آپ کو کوئل کی کوک بھی سنائی دیتی ہے اور پپیہے کی پکار بھی، بادل کی گرج کے ساتھ مینڈک کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ اور رات کو جھینگر کی آواز بھی۔ کہیں شاعر اپنی سکھیوں کے ساتھ بسنت کھیلتا نظر آتا ہے، سکھیاں رنگ کی پچکاریوں میں شرابور ہو گئی ہیں۔ محل کے در و دیوار رنگین ہو گئے ہیں بلکہ سارا تر لوک رنگین نظر آتا ہے۔ کدم کی خوشبو سے فضا معطر ہے۔ کہیں عود اور برکی کی لپٹیں آ رہی ہیں اور عنبر و گلال کی بارش ہو رہی ہے۔ کہیں پھولوں پر بھنورے منڈلا رہے ہیں اور شاعر اور اس کی سکھی، ہاتھ میں ہاتھ دیے گلے میں پھولوں کی مالا پہنے سرو بن میں گھوم رہے ہیں''۔ [۱۷]

اُن لباسوں و زیور کی بھی اچھی خاصی فہرست تیار ہو جاتی ہے، جو عہدِ عادل شاہی تہذیب کی خاص اشیاء تھیں۔ اور جن کا استعمال خواص و عوام میں ہوتا تھا:

ہری چولی کی کیا تعریف کروں اودے ڈنڈارس کا
تو گوری خوب لگتا ہے تہبد نولال اطلس کا

زرینہ، زری، پشواز، کُرکی، چولی، جنتری، گھونگھٹ، کسنبہ، بادلا، پامیاں، ڈنڈارس، پنچولہ، تنکٹ، پتمبر، سالو، ولا ہلمل، مندیل، شال، پٹکا، شلوار، جھلکا اور دولڑی، گلسر، بدھی، ہنس، سیس پھول، کرن پھول، بالیاں، جھمکیاں، پدک، موتیوں کی جالی، کنٹھ مالا، پولارے، بچھوے، گجرے، انوٹ، پینجن، مول، گھنگھرو، گوٹھاں، جوہی، زرکمر، ٹیلا، سہور سیس پھول، چندر، رُن جھن کے چھلّے، منگڑی، کوٹاں، زنگ وغیرہ فہرست ہے کہ لمبی ہوتی جاتی ہے۔

خود گولکنڈہ کی قطب شاہی حکومت کا تہذیبی و تمدنی اعتبار سے نہایت زرخیز دور رہا ہے۔

شاہانِ گولکنڈہ نے شعروادب کی نہ صرف سرپرستی کی بلکہ خود بھی صاحبِ دیوان شاعر ہوئے ہیں۔ یہی نہیں فنِ تعمیر، فنِ مصوری، فنِ نقاشی میں یہاں کے فن کار شہرت یافتہ تھے۔ خوبصورت باغات، نہروں کا خوبصورت جال اور نئے شہروں کی بنیاد نے گولکنڈہ کو ایک الگ صورت عطا کردی تھی۔

عہدِ قطب شاہی میں اسلامی تہذیب کے ساتھ ہندو تہذیب کا اس طرح اختلاط ہوا کہ صحیح معنوں میں گنگا جمنی تہذیب بن گئی۔ لباس، خوراک، زیورات، روزمرہ کے تمام کاموں میں مقامیت جھلکتی ہے۔ مساجد، مقابر، محل، آشورہ خانے مشترکہ تہذیب کی نشاندہی کرتے ہیں۔

قلی قطب شاہ کی شاعری مشترکہ تہذیب کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔ تہذیب کے ہر پہلو کو قلی قطب شاہ نے شعر کا جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ جس میں اس کی متنوع خصوصیات کی حامل شخصیت کا دخل بھی تھا۔ اس کی سیرت خوبصورت اور اس کا ظاہر اور باطن ایک تھا۔ امن پسندی، صلح جوئی، رحم دلی و دریا دلی اس کے خمیر میں رچی ہوئی تھی۔

اس طرح مختلف شعروں میں مختلف اشیاء کا ذکر ملتا ہے جیسے کنٹمال یا کنٹھ مال گلے میں پہننے والا ایک ہار ہے جس میں موتی تسبیح کی طرح پروئے ہوتے ہیں۔ اور درمیان میں جگہ جگہ قیمتی دھاتوں کے خوبصورت نقش و نگار والی پلیٹیں ہوتی ہیں۔ پھلری ناک میں پہننے والی لونگ جس میں کہیں موتی اور کہیں رنگ برنگے قیمتی پتھر جڑے ہوتے ہیں۔ اس طرح گل سری، حمایل چوسر اور چگنی کا ٹیلہ بالترتیب سر، بازو اور ماتھے پر لٹکنے والے زیور ہیں۔ علاوہ ازیں بالی کانوں میں، تعویذ بازو پر، گھنگھرو پایل پیروں میں، زنجیر گلے میں پہنے جانے والے زیورات وغیرہ کا ذکر بار بار آتا ہے۔ جو عوام وخواص میں رائج تھے اس کے علاوہ کنگن، سہ لڑی، باز و بند، ناگ سُر، پیچین، بندے، کمر پٹہ، ہنسلی، چوطرہ، بنگڑیاں، کرن پھول، کنا موتی، جگنی وغیرہ بھی اس وقت کی تہذیب میں نظر آتے ہیں۔ چند شعری مثالیں ملاحظہ کیجیے:

کنٹمال کنٹھ پاکر انچل جھمک دکھاکر
معانی کا دل بہلاکر ہت میں سوہت ملاتی

سب جواہراں کا کہاں لکھ کب ہے عجیب
پھلڑی کا موتی ناک پر سیکا دیسے

اپس ہاراں میں بنیاں عشق گوندے
حمایل چوسرہ جنجیم گجری تھے

مختلف ملبوسات کا ذکر، ہندوستانی آلاتِ موسیقی، پھل، پھول، پرندے و دریا کا بیان بھی قلی قطب شاہ کے یہاں پوری رعنائی کے ساتھ موجود ہے۔اور چنپا، کویل، چولی، بیر بہوٹی، تافتابند، بھنورے، موگرے، طنبورا، کنول، مور، پپیہے، گنگا، چھجہ، قند، صندل، ترن تارن، کماج، پھکنی وغیرہ وہ رنگارنگ اجزا ہیں جو قطب شاہی حکومت کے عہد کی تہذیب کا حصہ رہے ہیں۔اور جنھیں مختلف صنعتوں کے حوالے سے اور کہیں نہایت سادگی سے بیان کیا گیا ہے۔

سندور اور قشقہ لگانا ہندو تہذیب کا خاص مظہر ہے، جس کا بیان ہمیں قلی قطب شاہ کی غزلوں میں نظر آتا ہے:

تو ناز کی سوں جانو ناکس کے بھلا کے دل
پیشانی ٹیکا لائے ہیں سیندور جیوں سرج

پوجا، ارچنا کرنا ہندوؤں کی عبادت کا خاص الخاص طریقہ ہے، جس میں دیوی دیوتاؤں کی پرستش کی جاتی ہے اور ان سے اپنا مدعا بیان کیا جاتا ہے۔ پوجا نہ صرف بھگوان کی ہوتی ہے بلکہ اس کی بھی جسے ہندو اپنے دل میں خاص جگہ دے دیتے ہیں۔ جیسے عورتیں شوہروں کی، عام لوگ مذہبی، سماجی رتبے سے بلند افراد کی۔اس طریقۂ عبادت کا ذکر بار بار محمد قلی کے یہاں آیا ہے، جس کے ذریعہ وہ اپنے محبوب کو ایک خاص مقام عطا کر دیتا ہے:

بتخانہ نیں تیرے ہو ریت نیں کیا پتلیاں
منج نیں میں پوجاری پوجا ادھان ہمارا

ہندو جہاں عبادت کرتے ہیں اسے مندر کہا جاتا ہے، جو متبرک اور قابلِ احترام مقام ہوتا ہے۔ جہاں پر دعائیں مانگی جاتی ہیں و عبادت کی جاتی ہے۔ وہاں سے اگر پجاری کی مراد برآئے تو زندگی کامیاب گردانی جاتی ہے اور اسے زندگی کا حاصل قرار دیا جاتا ہے۔اس حوالے سے بھی شاعرِ دکن نے محبوب اور مندر کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ تقدس کے ساتھ عشق کو تشفی بھی حاصل ہوتی ہے:

سکی اپ حسن کا مندر بنائی
عرق اپ سکھ تھے پیالا مدبلائی

دورانِ عبادت کچھ منتر پڑھے جاتے ہیں جو نہایت متبرک ہوتے ہیں اور جن میں تاثیر ازحد خیال کیا جاتی ہے:

منترے اوپر منتر کرتی ہے دوتن
سجن کے تیں اپس گن سوں رتجھاوے

جنم اشٹمی کے موقع پر کرشن جی کا وہ عہد جوان کی خوردسالی پر منحصر ہوتا ہے انھیں جھولا جھلایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ باغوں میں لڑکیاں عموماً برسات اور بہار کے موقعوں پر جھولا جھولتی ہیں ایک تصور یہ بھی ہے کہ کرشن جی ایسے موقعوں پر گوپیوں کے جھولوں کو پینگیں بھی دیتے تھے:

میں متوالا توں متوالی کھلائی
نیں پھانسیاں ستیں اب نیں ہندولا جھلائی

ہندوستانی تہذیب کا ایک خاص جز یہ بھی ہے کہ جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ہاتھ جوڑتے ہیں۔ رام رام کہتے ہیں یا جب توبہ استغفار کا موقعہ ہوتا ہے تب بھی رام رام، ہر ہر مہادیو کا جاپ نعرے کے طور پر ہوتا ہے۔ اور اپنے سے بڑے اور قابلِ احترام شخص کے پاؤں چھوئے جاتے ہیں:

سر و نہ بھائے دیکھنے یک تل اگر او قد دکھوں
باؤں اُساس دم بدم شوق سوں ہات جور کر

ہندو اساطیر اور دیو مالائی قصوں کے ساتھ مذہب و سماج کے رویوں کا بھرپور عکس جہاں ملتا ہے وہیں ایرانی تہذیب بھی اپنی جگہ بناتی جارہی تھی۔ فارسی زبان و ادب کے حوالے سے ہی نہیں بلکہ ایران سے مضبوط رشتہ استوار ہونے کے سبب بھی (جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ اسلام کی جو صورت ہندوستان آئی وہ خالص اسلامی نہیں تھی۔ اس میں صدیوں پر محیط ایرانی تہذیب کے تمام مضبوط اور اقدار جگہ بنا چکے تھے۔) خود قطب شاہی حکمراں شیعہ مذہب اور ایران سے قربت رکھتے تھے۔

دکنی حکومتوں نے کبھی بھی فارسی کو بے عمل نہیں کیا۔ ہاں کبھی کبھی درمیان میں عادل شاہی حکومت کے دوران دکنی اردو کو سرکاری زبان کا درجہ ضرور دیا گیا، مگر اس سے فارسی زبان کو اہمیت کبھی کم نہیں ہوئی۔ فارسی ادب کے مطالعے نے دکنی ادب کو مختلف موضوعات سے زرخیز کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ہندوستانی دیگر رسومات کا ذکر ملتا ہے وہیں ہند ایرانی مشترکہ تہذیب کے مرقع بھی کھینچے گئے ہیں۔ جیسے

چوگان کھیل، فال نکالنا، مہندی لگانا، پان کھانا، بندی لگانا، تعویذ باندھنا اور بسنت منانا وغیرہ۔

محمد قلی قطب شاہ کی غزلوں میں عصری حالات، روزمرہ کے معمولات، ایقان صاف طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ ساتھ ہی مسلم تہذیب کے مختلف اجزاء اور روایات کا باہم اشتراک صاف طور پر نظر آتا ہے۔ چاہے رستم و سہراب ہوں یا موسیٰ و طور، جنت و دوزخ کا ذکر ہو کہ بت خانہ و مسجد کا، زنار ہو کہ تسبیح۔ زاہد ہو کہ واعظ، زکوٰۃ ہو کہ حج، فارسی ادب کے اثرات نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ خود محمد قلی قطب شاہ نے حافظ کی غزلوں کا پورا پورا چربہ اتارا ہے:

گدا تج عشق کا ہوں دے ذکاتِ عشق سنج سائیں
کہ ہے تج اعجاز منج من کو جیوں عیسیٰ مریم کا

عشق کا ملک تری یاد سیتی جیتا ہوں
دستے ہیں میرے انگے رستم ہو کہ سام عبث

زبان جو تہذیب کا ایک اہم عنصر ہے اس کی تشکیل و ترتیب میں شعرا و ادبا کا خاص حصہ ہوتا ہے۔ قطب الدین قادری فیروز اور محمود قطب شاہی دور کے ایسے ہی شاعر تھے، جنھوں نے شعوری طور پر دکنی اردو کو فارسی کے قریب لانے کی کوشش کی۔ اس کے مزاج و معیار کو فارسی زبان کے سانچے میں ڈھالنے کی سعی کی:

تیری کمر کی ہاوی سِکھ سِکھ ہوا جو دبلا
جیوں تار پیرہن کا، یہ تار پیرہن میں

(فیروز)

غواصی، سلطان محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، ابوالحسن تانا شاہ کی غزلوں میں بھی عصری تہذیب کی روح کی ترجمانی نظر آتی ہے:

بے مثل تیرے گال ہور نادر ترے خال تھے
اسلام اُجالا پا گیا ہور کفر سو کالا ہوا

قطب شاہی دور عیش و آرام اور سکونِ زندگی سے ہم کنار رہا۔ معاشرہ خوشحال، سماج روایات کا پاسدار اور بادشاہِ وقت اقدار کے امین رہے۔ یہی سبب ہے کہ گولکنڈہ کی تہذیب اپنے عہد میں اس

زرّیں دور کی ترجمان ہے، جہاں حاکم ومحکوم ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے، پرسکون اور پرمسرت زندگی گزار رہے تھے۔

مگر اورنگ زیب کے ہاتھوں فتح دکن (۱۶۸۶ء) کے ساتھ دکنی تہذیب کا شیرازہ بکھر گیا۔ نئی حکومت، نئے خیالات، نئے احکامات نے شعروسخن کے اس گہوارے کو اجاڑ دیا۔ اہلِ سخن کا جس طرف منہ اٹھا راہ لی، چند اصحاب جو کہیں جانہ سکے وہ وہیں بیٹھ کر مرثیہ کی صورت میں اپنے ماضی واقتدار کا نوحہ کرنے لگے۔ بدلتے ہوئے تہذیبی حالات نے جو سیاسی، معاشی وسیاسی سطح کے ساتھ لسانی سطح پر بھی واقع ہورہے تھے پورے سماج خاص کر حساس طبقہ یعنی شعراء وادباء کو بہت متاثر کیا۔ اب فارسی محاورہ بندی نے بھی زبان کو زیادہ سبک ورواں بنادیا۔

اس دور میں تمام شعرا مرثیہ ومثنوی میں اپنے جذبات کا اظہار کررہے تھے مگر کہیں کہیں غزلیں بھی کہی جارہی تھیں۔ مگر وہ بھی صرف تفنّنِ طبع کی خاطر، جن میں سید محمد خاں عشرتیؔ، فقراللہ آذرؔ، وجہہ الدین وجدیؔ، سید محمد فراقیؔ جیسے شعرا شامل ہیں۔ بعد ازاں ولیؔ، عزلتؔ، سراجؔ اور داؤدؔ جیسے اردو شاعری کے نمایاں ستون پیدا ہوئے، جنھوں نے نہ صرف اردو زبان کو بلکہ اردو شاعری کو خاص طور سے غزل کو نمایاں مقام عطا کیا۔

فتح دکن سے قبل غزل کا محور بھی عورتوں کی یا عورتوں سے باتیں کرنا ہی سمجھا اور اختیار کیا جاتا رہا تھا۔ مگر ولیؔ نے اس محدود ذہن وخیال کو وسعت دی۔ عورت جو دکنی تہذیب میں صرف دل بہلاوے، رنگ رلیاں منانے، اٹکھیلیاں کرنے اور اس سے لذت حاصل کرنے کا ہی ذریعہ تھی۔ ولیؔ نے اسے پامال تصورات سے آزاد کرایا اور خارجیت میں داخلیت کو شامل کر کے متنوع احساسات کا حامل بنادیا۔ اور زندگی کو مختلف خوشنما رنگوں سے متعارف کرایا۔ غزل جو عاشقانہ شاعری کی ایک صنف ہے اور معاملات عشق کو بیان کرنے کا خوبصورت طریقہ ہے، کو ولی نے روحانیت اور عشقِ الٰہی کے طور پر بھی ایسا استعمال کیا کہ دلوں میں گرمی وحرارتِ ایمان پیدا ہوگیا۔

زوال آمادہ معاشرہ میں انسان حقیقت سے نگاہیں چرا کر خود کو لہو ولعب میں ڈبو دیتا ہے وہیں دوسری جانب وہ قربِ الٰہی حاصل کر کے اپنے وجود تک کو فراموش کردیتا ہے۔ اور یہ وہی عہد تھا، جب پورے معاشرے پر تصوف کے بادل چھائے ہوئے تھے جو نہ صرف برس رہا تھا بلکہ چہار سو سبزہ بھی اس کی زرخیزی کا اعلان کررہا تھا۔ پوری تہذیب کا آماجگاہ عشقِ یعنی عشقِ حقیقی بنا ہوا تھا۔ قربِ الٰہی، دید

الٰہی کے شوق میں ہر طرف ایک ہی جلوہ دکھائی دیتا۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اس عہد کے متعلق لکھتے ہیں:

''تصوف اس زمانے کی فکری اور اخلاقی بلندی کا معیار تھا۔ وحدت الوجود کا عقیدہ جذب و سلوک اور معرفت کے لیے واحد بنیاد کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیاقت، علمیت، بلند مذاقی اور بلند نظری سب میں یہی صوفیانہ طریق رچا ہوا تھا... ولیؔ نے بھی اس مسلک کو نہ صرف اپنی زندگی میں برتا بلکہ اپنی شاعری میں بھی اس خوبی سے اظہار کیا کہ ان سے پہلے کسی نے اردو میں اتنی کامیابی سے نہیں برتا تھا۔ چوں کہ وحدت الوجود کے نظریے کے مطابق صرف ذاتِ باری ہی کا وجود حقیقی سمجھا جاتا ہے اور ماسوائے اللہ کا وجود محض ذہنی اور اعتباری ہے اس لیے دنیا کی بے ثباتی، زندگی کی بے اعتنائی وغیرہ کے مضامین ولیؔ کے یہاں بہت خوبی سے بندھے ملتے ہیں''۔ [۲۷]

ولیؔ اور ان کے معنوی شاگرد سراجؔ، داؤدؔ اور عزلتؔ کے یہاں بھی متصوفانہ اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔ ولیؔ پر تو صوفی تصورات کا اثر تھا مگر دیگر کی تو زندگی ہی عین صوفیانہ تھی:

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سے اوّل
طالبِ عشق ہوا صورتِ انساں میں آ

(ولیؔ)

دونوں عالم سے مشرب مست وحدت کا ہے نرالا
میرے ایک ہاتھ میں تسبیح ہے، ایک ہاتھ میں پیالا

(عزلتؔ)

اے بت پرست دیدۂ بینا میں دیکھ توں
یک ذات میں ظہور ہوا کئی صفات کا

(سراجؔ)

دکن چوں کہ اپنی سیکولر روایات کا ہمیشہ سے امین رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ہندو و اسلامی اصطلاحات کے ساتھ ساتھ دونوں تہذیبوں کی تلمیحات کا بھی خوبصورت امتزاج نظر آتا ہے، جیسے

آئینۂ سکندری، لوحِ محفوظ، چاہِ کنعاں، عَلَم، جانِ من، درس، سری جن، چشمۂ آبِ بقا، چاہِ زنخنداں، عیسوی دم، سامری، شق القمر، پردۂ فانوس، نرگس، شاہین، قاضی، تازی، رازی، رشکِ مہہ کنعاں، عالم گیر، شرابِ ارغوانی، لباسِ زعفرانی، موہن، آبِ زلال، بلبل، زیروزبر، سنگم، شک، صندل، سجن، چرن، پتیم، سوگند، آبِ خضر، دیدۂ یعقوب، چشمۂ خضر، نقش چرن، یدِ بیضاء، سایۂ بالِ ہما، درپن، پران، دارالحرب، مہندی، چمپا، مہرِ سلیمانی، رام، لچھمن، آتشِ نمرود، بیراگ، دارالسلام، آئینۂ حیراں، زلفِ حمیتِ دل، کاشانۂ زنبور، کبابِ دل، دان، برہ کے تیرِ باراں، نشۂ معجون، شیشۂ آتشی، آرسی، درسن، دارو رسن وغیرہ:

گنگا راوں کیا ہوں اُپس کے نین ستی
آ اے صنم شتاب ہے روزِ نہان آج

(ولیؔ)

بغل میں لے رہا ہے کعبہ بھی کیتے دن بتوں کے تئیں
جو مقبول خدا ہو سو بتوں کو آشنا جانے

(عزلتؔ)

کفر و ایماں دو ندی ہیں عشق کیں
آخرش دونوں کا سنگم ہوگیا

(سراجؔ)

اسی کے ساتھ تہذیبِ ہندی میں رام اور لچھمن کا احترام، جوگن اور جوگی کے بھبھوت ملنا، خاکی لباس زیبِ تن کرنا، ارجن کے بان کا کمال، سر جھکا کے آنا بھی اہم ترین اعمال ہیں اور ہندوستان میں دھلنڈی و پچھمیں سماجک تہوار ہیں، سندور سہاگ کی نشانی ہے تو ہولی خوشی اور رنگوں کا تہوار ہے۔ چراغاں یا دیوالی رام کے بن باس سے واپس لوٹنے کی خوشی کا اظہار ہے۔ تیجا، دسواں اور برسی، شب برات خالص ہندوستانی رسومات ہیں جنھیں اسلامی رنگ میں رنگ دیا گیا ہے اسی طرح اماوس کی رات یا چاند، مٹھی میں مہندی بھر کر بند کر لینا، دان دینا، برہمن کے ذریعہ پوجا یا ہوَن کرانا، تعویذ باندھنا، بیراگ لینا، بانسری بجانا جو محبت کو جگاتی ہے، مرگ چھالا، ناقوس کی آواز وغیرہ سب ہندوستانی تہذیب کے دیگر عناصر ہیں:

بھکاری کوں درس کا دان پہنچا　　دل مفلس نے پایا وصل کا گنج

سدا دیول کی پوجا کام ہے ہر یک برہمن کا　　تصور تجھ بھواں کا اے صنم، سمرن ہوا من کا

ہندوستانی روایات و اصطلاحات کے ساتھ عربی و ایرانی تلمیحات و روایات کو بھی ہندوستانی شعرا نے اپنے کلام کا اہم حصہ بنایا۔ ان کا خوبصورت اور برمحل اظہار ہماری اردو غزلوں میں بار ہا ملتا ہے۔ جیسے، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، یوسف، چاہِ کنعاں، طور و موسیٰ، سکندر و خضر، آتشِ نمرود، چاہِ زمزم، حجر اسود، روزہ و مصلا، عابد و زاہد، واعظ و شیخ، شیخ و برہمن، کافور و صندل، کعبہ و دیر، تسبیح و زنار، امام ومقتدی وغیرہ۔

ایہام گوئی جو تاریخِ ادب میں اہمیت رکھتی ہے اس کا آغاز بھی اسی دور میں ہوا۔ جس کو عروج شمالی ہند کے ابتدائی اردو غزل گو شعرا نے بخشا۔ ایہام میں ایک لفظ ایسا لایا جاتا ہے جس کے دو معنی ہوتے ہیں ایک قریب کے اور دوسرے دور کے اور شاعر دور کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ اُس وقت کے سیاسی حالات ایسے تھے کہ گفتگو یا تنقید و تنسیخ کھل کر نہیں کی جاسکتی تھی، نتیجتاً ایہام گوئی کا آغاز ہوا جسے ہم ولی کی تہذیب کا عصری تقاضا بھی کہہ سکتے ہیں:

بچا دل زلف کے عقرب سے تو کیا　　کہ چوٹی ناگنی پیچھے پڑی ہے　(عزلت)

مت جھٹک ہم جلوں اوپر دامن　　بات سن، راکھ لے اڑا مت دے　(عزلت)

زندگی محیط ہوتی ہے روز گوناگوں گزرنے والے واقعات پر، جن میں کچھ خوبصورت لمحات ہوتے ہیں، تو کہیں غم و غصے کے جذبات، کچھ تمنائیں ہوتی اور کچھ خواہشات۔ ہم زندگی سے بہت کچھ لیتے بھی ہیں اور اس کو دیتے بھی ہیں۔ ٹھہرنا یا جامد ہونا انسانی تخیل کے منافی ہے۔ اس کی سوچ تعمیری ہو یا تخریبی اسے متحرک رکھتی ہے۔ یہی حرکت زندگی کی غماز ہے۔

□□□

حوالے

۱۔	تاریخ تہذیب	برنٹن		۱۹۶۵ء	صفحہ ۲۴
۲۔	قومی انگریزی اردو لغت	جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۹۳ء	صفحہ ۵۰۰
۳۔	سازمان چاپ وارشادات		جاویدان	۱۹۴۲ء	صفحہ ۳۱۷
۴۔	بیان اللسان	قاضی زین العابدین			صفحہ ۱۴۹
۵۔	لغاتِ کشوری	تصدق حسین	مطبع منشی تیج کمار، لکھنؤ	۱۹۷۲ء	صفحہ ۱۶۲

۶۔ اردو کی ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ — عتیق اللہ تابش — اردو مجلس، غالب اپارٹمنٹ، دہلی — ۱۹۹۵ء — صفحہ ۵۴۵

۷۔ ایضاً

۸۔ نور اللغات اردو (جلد سوم) — جنرل پبلشنگ ہاؤس، کراچی — مارچ ۱۹۵۹ء — صفحہ ۳۲۶

۹۔ فرہنگ برگزیدہ، — حسن عمید — ۱۹۴۲ء — صفحہ ۳۳۳

۱۰۔ القاموس الجدید اردو عربی — وحید الزماں کیرانوی — کتب خانہ حسینیہ دیوبند — ۱۹۹۸ء — صفحہ ۲۸۸

۱۱۔ بیان اللسان — قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی — صفحہ ۱۶۰

۱۲۔ لغاتِ کشوری — تصدق حسین — مطبع منشی تیج کمار لکھنؤ — ۱۹۷۲ء — صفحہ ۱۷۳

۱۳۔ سنسکرت شبدارتھ کوستبھ — لالہ رام نرائن لال — الٰہ آباد — صفحہ ۸۷۴

۱۴۔ بھارگو دوش ہندی شبد کوش — بھارگو بکڈپو، وارانسی — صفحہ ۶۲۰

۱۵۔ نیو آکسفورڈ السٹریٹڈ ڈکشنری، (جلد اول) — ۱۹۷۰ء — صفحہ ۴۰۹

۱۶۔ قومی اردو انگریزی لغت — جمیل جالبی — پاکستان — صفحہ ۵۰۰

۱۷۔ اسٹڈی آف ہسٹری — ٹائن بی — آکسفورڈ یونیورسٹی پریس — ۱۹۶۲ء — صفحہ ۵۵۰

۱۸۔ تاریخ تہذیب — برنٹن — شیخ غلام اینڈ سنز — ۱۹۶۵ء — صفحہ ۳۳

۱۹۔ مقدمہ ابن خلدون — ترجمہ: مولانا سعد حسن خاں — صفحہ ۲۶۰

۲۰۔ ایضاً — صفحہ ۳۹۷

۲۱۔ Encyclopedia of religion and ethic (James Hastug) Vol IV, — صفحہ ۳۵۸

۲۲۔ Encyclopedia of Social Science. — صفحہ:۶۲۱

۲۳۔ Encyclopedia of Social Science. — صفحہ:۶۴۵

۲۴۔ Encyclopedia of Social Science — صفحہ:۶۲۳

۲۵۔ E. B. Tylor, Primitive Culture — صفحہ:۱

۲۶۔ "A Scientific Theory of Culture" Malinowski — ۱۹۴۴ء

۲۷۔ " Peasent Society and Culture" R Redfield — ۱۹۵۶ء — صفحہ ۱۰

۲۸۔ Encyclopedia of Britanica — صفحہ:۳۱۵

۲۹۔ Culture and History — فلپ بابی — صفحہ:۸۸

۳۰۔ Cultural Sociology — جان اولس — ص:۱۴۰-۱۳۹

۳۱۔ ایضاً — صفحہ:۱۴۹

۳۲۔ Cultural background of personality، رالف لنٹن — صفحہ:۲۱

۳۳۔ Freedum and culture — رادھا کرشنن — صفحہ:۲۴

۳۴۔ The centre of indian culture، رویندر ناتھ ٹھاکر — صفحہ:۱۵

۳۵۔ Cultural Anthropology ایم۔ جے۔ ہرسکووٹز — ۱۹۷۴ء — صفحہ:۳۰۶

۳۶۔ E.A. Hoebel, Man in the Primitive World — ۱۹۴۹ء — صفحہ:۴۲۵

۳۷۔ Cultural Background of personality، رالف لنٹن — صفحہ:۴۰

۳۸۔ قومی تہذیب کا مسئلہ — ڈاکٹر سید عابد حسین — انجمن ترقی اردو ہند — ۱۹۵۵ء — صفحہ: ۶

۳۹۔ تصورات — عبد المغنی — ادارہ فکر جدید — ۱۹۸۸ء — صفحہ:۱۴۳

۴۰۔ مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ — محمد حسن — ترقی اردو بیورو — ۱۹۹۰ء — صفحہ:۲۵۳

۴۱۔ اسلامی تہذیب اوراس کے اصول ومبادی	سید ابوالاعلیٰ مودودی	مرکزی مکتبہ اسلامی	۱۹۷۷ء	صفحہ:۱۱
۴۲۔ قومی تہذیب کا مسئلہ	ڈاکٹر عابد حسین	ترقی اردو بیورو	۱۹۵۵ء	صفحہ:۲۸
۴۳۔ ایضاً				صفحہ:۱۴
۴۴۔ ایضاً				صفحہ:۲۹
۴۵۔ غزل اور متغزلین	ابواللیث صدیقی اردو مرکز		۱۹۵۴	صفحہ ۱۱۵
۴۶۔ تنقیدی زاویے		ڈاکٹر عبادت بریلوی		صفحہ:۵۵
۴۷۔ دلّی کا دبستانِ شاعری	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	انجمن ترقی اردو	۱۹۴۹ء	صفحہ:۳۶
۴۸۔ دلّی کا دبستانِ شاعری	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	انجمن ترقی اردو	۱۹۴۹ء	صفحہ:۳۷
۴۹۔ اردو غزل	یوسف حسین	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ	۱۹۵۲ء	صفحہ:۱۴
۵۰۔ جدیدیت کی فلسفیانہ اساس	شمیم حنفی		۱۹۷۷ء	صفحہ:۵۔۳۰۴
۵۱۔ تمدنِ اسلام	عبدالماجد دریابادی	ادارہ ادبیات، دہلی		صفحہ:۷
۵۲۔ ایران: عہد قدیم کی سیاسی، ثقافتی ولسانی تاریخ	لیفٹننٹ ڈاکٹر محمد عالم			صفحہ:۵۳
۵۳۔ قدیم ایرانی وزرتشتی عناصر اردو ادب میں		ڈاکٹر نذیر احمد	اپریل	۱۸۶۱ء فکرو نظر صفحہ:۱
۵۴۔ ایضاً				
۵۵۔ مطالعۂ غزل	ڈاکٹر عبادت بریلوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۷۴	صفحہ ۱۴۔۱۳
۵۶۔ اردو غزل	یوسف حسین خاں	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ	۱۹۵۲	صفحہ ۱۷
۵۷۔ غزل کا نیا منظرنامہ	ڈاکٹر شمیم حنفی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۸۱	صفحہ ۲۰
۵۸۔ مطالعۂ غزل	ڈاکٹر عبادت بریلوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۷۴	صفحہ ۶
۵۹۔ غزل کا نیا منظرنامہ	ڈاکٹر شمیم حنفی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۸۱	صفحہ ۵۲
۶۰۔ جدید غزل	رشید احمد صدیقی	سرسید بکڈپو، جامعہ اردو علی گڑھ	۱۹۹۰	صفحہ ۹
۶۱۔ ایضاً				
۶۲۔ اردو غزل	یوسف حسین خاں	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ	۱۹۵۲	صفحہ ۱۳
۶۳۔ کلیاتِ قلی قطب شاہ	ڈاکٹر سیّدہ جعفر	ترقی اردو بیورو، دہلی	۱۹۸۵	صفحہ ۱۳
۶۴۔ دکنی ادب کی تاریخ	محی الدین قادری زور	اردو اکادمی سندھ، کراچی	۱۹۶۰	صفحہ ۱۶
۶۵۔ ایضاً				صفحہ ۱۸
۶۶۔ ایضاً				صفحہ ۲۶
۶۷۔ دکن میں اردو	نصیرالدین ہاشمی	اردو مرکز، لاہور	۱۹۵۲	صفحہ ۱۶۰
۶۸۔ ایضاً				صفحہ ۲۰۸
۶۹۔ دیوانِ ہاشمی	ڈاکٹر حفیظ قتیل	ادارہ ادبیاتِ اردو	۱۹۶۱	صفحہ ۲۱۔۲۲
۷۰۔ کلیاتِ قلی قطب شاہ	ڈاکٹر سیّدہ جعفر	ترقی اردو بیورو، دہلی	۱۹۸۵	صفحہ ۱۰۷
۷۱۔ دبستانِ گولکنڈہ ادب اور کلچر	ڈاکٹر محمد علی اثر	الیاس ٹریڈرس، حیدرآباد	۱۹۸۱	صفحہ ۵۴۔۵۵
۷۲۔ کلیاتِ ولی	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	انجمن ترقی اردو ہند، دہلی	۱۹۴۵	صفحہ ۷۵

□□□

Composite Indian Culture and Urdu Ghazal

(Monograph)

From:

TAHIRA MANZOOR